خوفناک جزیرہ

خوفناک جزیرہ

سراج انور

شمع بک ڈپو نئی دہلی

ایک ایسے نوجوان کے سمندری سفر کی حیرت انگیز داستان، جس نے قدم
قدم پر ہزاروں مصیبتیں جھیلیں۔ طوفانوں سے لڑا، خطروں کا مقابلہ کیا،
اور نہایت عجیب و غریب واقعات سے گزرنے کے بعد وہ ایک معمولی
ملازم سے بڑھ کر بہت بڑا آدمی بن گیا!!

میرا نام فیروز ہے، ایک غریب ماں باپ کا لڑکا ہوں، ابھی میری عمر صرف بائیس سال کی ہے۔ لیکن اس عمر میں ایسی ایسی تکلیفیں اور ایسی مُصیبتیں میں نے جھیلی ہیں جن کو یاد کر کے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ ایسے عجیب و غریب واقعات اور اتنی حیرت انگیز باتیں مُجھے اپنے سفر میں پیش آئی ہیں کہ میں انہیں اس وقت بیان کرتے ہوئے لرز رہا ہوں۔ میری اب تک کی زندگی آفتوں اور تکلیفوں میں ہی بسر ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں

کہ میں بڑا باہمّت ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں اپنی یہ داستان لکھ رہا ہوں ورنہ کسی دوسرے کے بس کا یہ کام نہ تھا، کیوں کہ ایسی داستان کو لکھنے کے لیے انسان کے سینے میں پتھرّ کا دِل ہونا چاہیئے۔

میں نے جس سفر کے بارے میں اوپر لکھا ہے وہ آج سے کوئی آٹھ سال پہلے شروع ہوا تھا۔ میں دِلّی کے ایک ہوٹل میں بیرا تھا، اس ہوٹل میں دُنیا بھر کے سیاح آتے جاتے رہتے تھے۔ اس لیے مُجھے نئے نئے لوگوں سے ملنے کا اتّفاق ہوتا رہتا تھا۔ جب یہ لوگ اپنے ملکوں کی باتیں کرتے تو میں بھی سُنتا۔ یہ باتیں سُنتے سُنتے میرے دِل میں بھی اشتیاق پیدا ہوتا کہ کاش کسی طرح میں بھی دور دراز کا سفر کروں! مُجھے کیا معلوم تھا کہ میری یہ خواہش جلد ہی پوری ہونے والی ہے۔ میں بھی سندباد جہازی کی طرح ایک طویل سفر کروں گا اور واپس آنے کے بعد پھر کبھی سفر کا نام نہ لوں گا!

ایک دِن ہمارے ہوٹل میں تین غیر ملکی سیاح آکر ٹھہرے، ہوٹل کا قاعدہ ہے کہ ایک آدمی کو ایک ہی کمرہ دیا جاتا ہے، اگر تین چار آدمی ایک ہی کمرے میں مل کر رہنا چاہیں تو نہیں رہ سکتے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجّب ہوا کہ ان تینوں نے ایک ہی کمرے میں رہنے کی اجازت حاصل کرلی اور یہ میری بد نصیبی تھی کہ ان کی خدمت کے لیے مُجھے مقرّر کیا گیا۔ پورے دو دِن تک وہ تینوں اپنے کمرے میں ہی بند رہے، نہ انہوں نے چائے منگائی اور نہ کھانا۔ سب کو حیرت تھی کہ وہ اندر بیٹھے ہوئے کیا کرتے رہتے ہیں؟ میرا دِل چاہتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مُجھے اپنے کمرے میں بلانے کے لیے گھنٹی بجائیں تاکہ میں ان کے راز سے واقف ہو سکوں، بچپن ہی سے مُجھے لوگوں کے رازوں کو جاننے کا شوق ہے۔ خواہ مخواہ خطروں میں کود پڑنا میری عادت میں شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ میں ان پُر اسرار

آدمیوں سے جلد سے جلد ملنا چاہتا تھا۔ میں کمرے میں بیٹھا ہوا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک گھنٹی بجی، میں نے دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کی طرف دیکھا۔ کمرہ نمبر ۵ کا بلب روشن تھا، خوشی کے مارے میں اچھل پڑا، کیوں کہ وہ تینوں آدمی اسی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی لباس ٹھیک کیا، ٹوپی اوڑھی اور تقریباً بھاگتا ہوا ان کے کمرے کے قریب پہنچا۔ دستک دینے پر اندر سے آواز آئی :

"آجاؤ۔"

میں نے دروازہ کھولا اور پھر ادب سے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ان میں سے کسی نے میری طرف کوئی توجّہ نہیں کی۔ جو سب سے بڑا تھا اس نے ایک سفید کاغذ کو احتیاط سے لپیٹتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"آخرکار یہ کام تو ہوگیا، نقشہ اب تیّار ہے۔"

اس کے یہ کہتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کسی قسم کا نقشہ تیّار کر رہے تھے، کیوں کہ مُڑے ہوئے کاغذ کی ایک ہلکی سی جھلک میں نے دیکھ لی تھی۔ رنگ برنگی پنسلوں سے بنائی گئی لکیروں سے یہ راز ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی پوشیدہ جگہ کا نقشہ ہے، میرے اس خیال کی تصدیق ان تینوں کی شکلیں دیکھ کر بھی ہو جاتی تھی، ان کے چہرے اُترے ہوئے تھے، داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور آنکھیں متواتر جاگنے کے باعث سُرخ تھیں، وہ بار بار جماہیاں لے رہے تھے، نقشہ تہہ کر کے حفاظت سے ایک چرمی تھیلے میں رکھنے کے بعد اس شخص نے مُجھ سے کہا۔ "ارے تم آ گئے، دیکھو ہم لوگوں کے لئے بہت عمدہ کھانا لاؤ۔"

میں نے پھر ادب سے سر جھکایا اور واپس آ کر جلدی جلدی ان کے لیے کھانا چُنا۔ پھر کھانے کی ٹرالی لے کر ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ انہوں

نے کنگلوں کی طرح کُچھ ہی دیر میں کھانا ختم کر دیا۔ اور پھر ایک نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"فرمائیے۔۔۔۔۔؟ اِن روپوں کا کیا لاؤں؟" میں نے پوچھا۔

"اسے رکھ لو، یہ تمہاری ٹِپ ہے۔" اس شخص نے ہنس کر کہا۔

ٹپ کی لعنت ہمارے ہندوستان میں برسوں سے چلی آرہی ہے۔ بغیر کسی محنت کے ہم لوگ خواہ مخواہ اپنا ہاتھ دوسروں کے سامنے ٹِپ لینے کے لیے پھیلا دیتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی بھیک ہے جو ہم لیتے ہیں۔ مُجھے شروع ہی سے اس ٹِپ سے نفرت ہے، اس لیے میں نے انکار کی صورت میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی شکریہ۔۔۔۔۔۔میں ٹِپ نہیں لیتا۔" اُن کی آنکھیں حیرت کے

مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تعجّب سے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر مُجھ سے بولے۔ "تمہارا نام کیا ہے، کہاں رہتے ہو؟"

میں نے مختصراً اپنے بارے میں، انہیں سب کُچھ بتا دیا، میری باتیں سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اور پھر وہی شخص جواب تک مُجھ سے مخاطب تھا، کہنے لگا:

"سنو لڑکے! ہم لوگ ایک دور دراز سفر پر جا رہے ہیں، ہمیں ایک خادم کی ضرورت ہے، جو ہمارے ساتھ رہے، اور ہمارا کہنا مانے، تم اگر ہمارے ساتھ چلنے پر راضی ہو جاؤ تو ہم تمہیں پانچ سو روپے مہینہ دیں گے، تنخواہ ہم نے جان بوجھ کر بہت زیادہ کہی ہے، وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ جس چیز کی تلاش میں جا رہے ہیں وہ اگر ہمیں مل گئی تو پھر ہم اربوں روپے کے مالک ہو جائیں گے، تم ہمیں ایک شریف، ایمان دار اور نڈر لڑکے

نظر آتے ہو، اسی لیے ہم نے یہ پیش کش کی ہے۔ ہمیں ایک تو خزانہ ڈھونڈنا ہے جو راس کماری کے میدانوں میں دفن ہے اور دوسرا ایک جزیرہ جس کے بارے میں آج تک کسی کو معلوم نہیں اور نہ ہی وہ جزیرہ دُنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ لیکن ہمیں اُمّید ہے کہ وہ لنکا سے بہت دور چلے جانے پر ہمیں نظر آئے گا۔ اس جزیرے میں جو چیز ہمیں پکڑنی ہے، اس کے بارے میں ہم تمہیں ابھی نہیں بتا سکتے۔ اب تم یہ کہو کہ کیا تم ہمارے ساتھ چلنے پر رضا مند ہو؟ اگر نہیں تو پھر ہم تم سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری اِن باتوں کا کسی کو بھی پتہ نہ چلنا چاہیئے، اگر ایسا ہوا تو پھر معاف کرنا، تمہاری خیر نہیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے پائپ سلگایا دو تین لمبے لمبے کش لیے اور پھر مُجھ سے کہنے لگا:

"ہاں اب جواب دو، اُمّید ہے کہ تم نے اتنے عرصے میں ہر بات سوچ لی ہوگی۔"

سوچنا تو خیر کیا تھا مُجھے تو خود ہی ایسے واقعات میں حصّہ لینے کا بے حد شوق تھا، بغیر سوچے سمجھے میں نے ہاں کر دی۔ یہ جواب پا کر وہ شخص بہت خوش ہوا اور میرے قریب آ کر میری کمر تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"شاباش! بہادر لوگ اسی طرح جلدی سے فیصلہ کر لیتے ہیں۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تمہارے ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی میں تمہیں ابھی دے دیتا ہوں۔ کل ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے لیکن خبردار! کسی کو اپنی روانگی کے بارے میں کُچھ نہ بتانا، تمہاری آنکھیں کھلی رہنی چاہئیں لیکن زبان بند۔ سمجھ گئے؟"

"جی ہاں، خوب اچھّی طرح، بے فکر رہیے آپ مُجھے ہمیشہ اپنا وفادار پائیں

گے۔"

یہ جواب سُن کر وہ خوش ہوا اور پھر پانچ سو روپے مُجھے دیتے ہوئے کہنے لگا کہ اب تم تیّاری شروع کردو۔ دروازے میں سے نکلنے سے پہلے اس نے مُجھے پھر تنبیہ کی کہ میں کسی سے بھی اِن باتوں کا ذرا سا بھی تذکرہ نہ کروں، ورنہ میرا انجام اچھّا نہ ہوگا۔

دوسرے دِن سویرے ہی ہم لوگ ہوٹل سے نکل لیے، دہلی ریلوے اسٹیشن پر آکر میرے مالک نے (کیوں کہ اب میں اُسے اپنا مالک ہی کہوں گا) چار ٹکٹ راس کماری کے لیے، اُس کی فیاضی کا درحقیقت کوئی جواب نہ تھا۔ آپ لوگ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس نے میرے لیے بھی درجہ اوّل کا ٹکٹ لیا اور ہم چاروں ایک ہی ڈبّے میں جا کر بیٹھ گئے۔ اب یہاں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں ان تینوں مالکان کا آپ سے تعارف کرادوں۔

وہ شخص جس نے مُجھ سے باتیں کیں اور جو ادھیڑ عمر کا نظر آتا تھا، دراصل امریکن تھا۔ اس کا نام جان ولیم تھا، بہت زیادہ شریف اور بااخلاق آدمی تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ہر فن مولا ہے، سائنس میں بھی ماہر تھا اور ڈاکٹری میں بھی، بہت اچھّا حساب داں بھی تھا۔ دُنیا کی تقریباً سبھی زبانیں جانتا تھا۔ اس کے بر عکس اس کے دو ساتھی مُجھے زیادہ پسند نہیں آئے۔ ان میں سے ایک تو افریقی تھا، لمبا تڑنگا اور بہت ہی طاقت ور، گرمی ہو یا سردی وہ ہمیشہ کالے کپڑے پہننے کا عادی تھا۔ اس کی کمر سے کارتوس کی ایک پیٹی ہر وقت بندھی رہتی تھی، اور اپنی حفاظت کے لیے پستول بھی ہر وقت ساتھ رکھتا تھا، اتنا کالا تھا کہ رات میں نظر ہی نہ آتا تھا، اس شخص کا نام جیک تھا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہی میرا دِل کانپ جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت خطرناک تھیں۔ اب رہ گیا تیسرا آدمی تو وہ بہت دُبلا پتلا

اور چالاک تھا۔ مِصر کا رہنے والا تھا اور اس کا نام عبدل تھا۔ پستول تو خیر اس کے پاس نہیں تھا۔ ہاں البتّہ اپنے پاس ایک شکاری چاقو ہمیشہ رکھتا تھا، چاقو ہلال کی شکل کا تھا اور وہ اسے اس انداز سے پھینکتا تھا کہ کسی بھی جانور کو زخمی کر کے چاقو پھر اُس کے پاس واپس آجاتا تھا۔ بعد میں ہم لوگوں نے جب ایک بار ہرن کا شکار کیا تو بجائے گولی کے عبدل نے اُسی چاقو سے ہرن کو زخمی کیا۔ ہرن دس گز کے فاصلے پر تھا۔ عبدل نے چاقو گھما کر پھینکا، چاقو ہرن کی گردن کاٹنے کے بعد ہوا میں لہراتا ہوا پھر اس کے پاس واپس آگیا، عبدل کے اس چاقو کو جیک بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ کسی بات کا جواب بھی بس صرف اپنی آنکھوں کے اشاروں سے دیتا تھا۔ جان جیسے عمدہ خوش اخلاق انسان کے ساتھ ایسے عجیب و غریب دوست کو دیکھ کر مُجھے وحشت ہوتی تھی۔

ریل بڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ جان اپنے پائپ کے کش لگاتا ہوا کُچھ سوچ رہا تھا۔ لیکن جیک اور عبدل بڑی عجیب نظروں سے مُجھے دیکھ رہے تھے، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ان کی آنکھوں میں رحم نام کو بھی نظر نہ آتا تھا۔ اس لیے مُجھے اب ان آنکھوں کو دیکھتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا تھا۔ وہ دونوں مُجھ سے بالکل بات نہ کرتے تھے۔ البتّہ جان مُجھ سے بہت نرمی سے پیش آتا تھا۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ ہندوستان کے جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ چند اسٹیشن جلدی جلدی گزر گئے تو جان نے نقشہ نکالا اور اسے سیٹ پر پھیلا دیا۔ نقشہ پھیلانے کے بعد اُس نے اور اس کے ساتھ ہی اس کے عجیب ساتھیوں نے مُجھے اس طرح دیکھا گویا کہہ رہے ہوں:

"ہم تم پر بھروسہ کرسکتے ہیں؟"

میں نے ان نگاہوں کا مطلب سمجھ کر مُسکراتے ہوئے اپنا سر ہلا دیا اور وہ مطمئن ہو گئے۔ نقشہ کو دیکھتے ہوئے وہ آپس میں بحث کرنے لگے۔ ان کی بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ عبدل خزانے والی کہانی پر یقین نہیں رکھتا یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑا رہا تھا۔

اب یہ لکھنا تو بے کار سا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کس طرح راس کماری تک پہنچے، راستے میں کُچھ اتنی تکلیفیں بھی پیش نہیں آئیں جن کے بیان کرنے کی خاطر میں اس قصّے کو خواہ مخواہ لمبا کروں۔ ہاں ایک بات ضرور کہوں گا اور وہ کہنی بھی ضروری ہے کہ دِلّی سے لے کر راس کماری تک جتنے بھی اسٹیشن پڑے میں نے ریل کے ٹھہرنے پر ایک نہایت ہی مکروہ اور ڈراؤنا چہرہ بار بار اسٹیشن پر دیکھا، وہ کوئی عجیب شخص تھا۔ خُدا نے پوری دُنیا کی بد صورتی اُسے دے دی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، میرا تو

خیال ہے کہ جب وہ سوتا ہوگا تب بھی کھلی ہی رہتی ہوں گی۔ ناک بن مانس جیسی تھی اور مُونہہ کی جگہ ایک تھوتھنی سی تھی۔ کُبڑا بھی تھا، اور لنگڑا بھی۔ جب بھی ریل اسٹیشن پر ٹھہرتی یہ شخص کھڑکی کے قریب آکر اندر ضرور جھانکتا، میں نے ایک بات محسوس کی اور وہ یہ کہ اسے دیکھتے ہی جیک کے بھیانک چہرے پر ایک خوفناک مُسکراہٹ ضرور پیدا ہو جاتی۔ خُدا جانے کیا راز تھا!

ریل کا سفر ختم ہوگیا تو پھر ہم نے موٹر سے سفر کیا، خُدا جانے کہاں کہاں گئے، کتنے دریاؤں کو پار کیا، کتنے ندی نالے پھلانگے، غرض یہ کہ ہم آہستہ آہستہ ہندوستان کے بالکل جنوب میں پہنچ گئے، یہاں ہمیں اپنا سفر خچروں پر شروع کرنا پڑا کیونکہ اب آگے نہایت ڈراؤنا اور خطرناک جنگل نظر آنے لگا تھا۔ زندگی میں مُجھے کبھی اتنی گھبراہٹ نہیں ہوئی تھی جتنی کہ

اس وقت ہوئی۔ ایک انجانا خطرہ سامنے نظر آ رہا تھا۔ خُدا جانے کہ اس جنگل میں داخل ہونے کے بعد واپس باہر نکلنا بھی نصیب ہو گا یا نہیں؟ یہاں پہنچ کر جان نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا۔

"دوستو۔۔۔! یہی جنگل ہماری منزلِ مقصود ہے، اس کے اندر ہی کہیں وہ خزانہ چھپا ہوا ہے جس کی خاطر ہم اتنا لمبا سفر کر کے یہاں آئے ہیں، یہ جنگل اتنا گھنا ہے کہ دیکھ لو یہاں کتنا گہرا اندھیرا چھایا ہوا ہے، خطرناک جانور اور درندے بھی یہاں بہت بڑی تعداد میں ہیں، ہمیں ان سب کا مقابلہ کرنا ہو گا، آؤاب خُدا کا نام لے کر اندر بڑھیں۔"

سب نے اپنے خچروں کو ہانکا اور پھر ہم جنگل میں داخل ہو گئے، جانوروں کی آوازوں سے پورا جنگل کبھی کبھی گونج اٹھتا تھا۔ ورنہ بس دہی ٹڈّوں کا مدھم شور ہمارے دِلوں کو ہر وقت سہمائے جا رہا تھا۔ ہم پھونک

پھونک کر قدم رکھ رہے تھے ہمارے خچر کبھی کبھی اپنے کان کھڑے کر لیتے تھے۔ ہم بھی فوراً چونکنے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتے مگر خطرہ اس وقت تک کوئی پیش نہ آیا۔ اسی طرح گھنے درختوں کی شاخیں اِدھر اُدھر ہٹاتے، راستے کے جھاڑ جھنکار شکاری چاقوؤں سے صاف کرتے ہوئے ہم لوگ کوئی ایک میل اندر گھُس آئے۔ ابھی ہمیں اور آگے جانا تھا، تھوڑی دیر دم لینے کے بعد جیسے ہی ہم نے سفر دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ سامنے کی جھاڑیاں ہلیں اور پھر ان میں سے ایک شخص نمودار ہوا۔ مگر یہ دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی کہ وہ شخص میرا جانا پہچانا وہی اسٹیشن پر بار بار آکر جھانکنے والا کُبڑا تھا۔ کتنی حیرت انگیز بات تھی؟ اور کتنا عجیب واقعہ! جس شخص کی ہم نے کوئی اہمیّت نہ سمجھی تھی اور جسے میں نے سرسری طور پر دیکھا تھا۔ وہ انسان اب میرے سامنے کھڑا ہوا مُجھے اور

جان کو حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اس وقت اس کی کمان جیسی جھکی ہوئی کمر بڑی عجیب نظر آ رہی تھی، اسے دیکھتے ہی جان نے اپنی بندوق کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔ عبدل نے بھی اپنا ہلال نما چاقو نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ البتّہ جیک بالکل خاموش کھڑا رہا۔ میں کنکھیوں سے جیک کو دیکھا تو اندازہ لگایا کہ وہ اس کُبڑے اجنبی کی آمد سے خوش ہے۔ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مُجھے اپنے مالکوں میں سب سے زیادہ جان پسند تھا۔ اس لیے میں جلدی سے اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سچّی بات ہے، مُجھے بندوق وغیرہ چلانی تو آتی نہ تھی۔ اس لیے مجبوراً مُجھے پناہ ڈھونڈنی پڑی ورنہ دِل تو میرا چاہتا تھا کہ اس اجنبی کُبڑے کے کُب میں اتنے زور کا گھونسا ماروں کہ وہ ہمیشہ کے لیے سیدھا ہو جائے۔

آپ شاید پوچھیں گے کہ ہم لوگ جب کہ اس اجنبی کے بارے میں کُچھ

جانتے بھی نہ تھے، اچانک اس سے اتنے خوفزدہ کیوں ہو گئے؟ میں عرض کروں گا کہ خُدا نے انسان کا چہرہ پورے جسم میں ایسا بنایا ہے جو اس کی عادت اور اس کے ارادوں کو فوراً ہی ظاہر کر دیتا ہے، یہی وجہ تھی کہ اس کی خوفناک صورت کو دیکھتے ہی جان نے اس کی طرف بندوق تان لی تھی۔ بندوق کا رُخ اپنی طرف دیکھ کر وہ مُسکرایا۔

"کون ہو تم۔۔۔؟" جان نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

"مُجھ سے ڈریے مت۔۔۔۔ میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" کُبڑے نے جواب دیا۔

اس کی آواز سن کر مُجھے بڑی حیرت ہوئی۔ عجیب تھر تھراتی ہوئی اور باریک آواز تھی۔ انگریزی وہ میری ہی طرح ٹوٹی پھوٹی بولتا تھا، مگر آواز میں تھوڑا سا توتلا پن شامل تھا، جس کے باعث اس کا لہجہ کافی پُر اسرار محسوس

ہوتا تھا۔ جان کی میں تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اس کے جواب سے مطمئن ہو جانے کی بجائے اُسی طرح بندوق تانے اس کے سامنے کھڑا رہا۔ میں باری باری ہر شخص کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ سب سنجیدہ تھے ہاں البتّہ جیک کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ نظر آتی تھی۔ عبدل اب تک تو خاموش تھا لیکن اس کُبڑے کو بڑی ڈھٹائی سے ہنستے دیکھ کر کہنے لگا۔

"نقصان بھلا تُم کس طرح پہنچا سکتے ہو، ہم لوگ اتنے کمزور نہیں ہیں، اور پھر تم سے ڈرنے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ ہمیں تو صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ تم کون ہو اور اس دور دراز جگہ پر بھیانک جنگل میں جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا، کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

کُبڑا یہ سن کر ہنسا اور دو قدم آگے بڑھ کر کہنے لگا۔

"کیا آپ نے کبھی کُبڑے جادوگر کا نام نہیں سنا؟ خادم ہی کو کہتے ہیں، مُجھ سے دُنیا کی کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے، میں ہر شخص کے دِل کا راز جانتا ہوں۔ مُجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے، اور گزشتہ دِنوں میں کیا ہو چکا ہے، کُبڑا جادوگر تو مُجھے لوگ اس لیے کہتے ہیں کہ۔۔۔۔۔۔۔۔اب میں کیا بتلاؤں، آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ویسے میرا نام چیتن ہے، مگر میں چاہوں گا کہ آپ مُجھے کُبڑا جادوگر کہہ کر ہی پکاریں۔ کہیے کیا اس کے بعد بھی کوئی بات باقی رہ جاتی ہے جس کے بارے میں آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

عجیب شخص تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں خود اتنا خوفزدہ تھا کہ ابھی تک اپنے مالک جان کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ مُجھ میں اتنی ہمّت نہ تھی کہ اُس کے سامنے آکر کھڑا ہوتا۔

میں نے دیکھا کہ اس کا یہ جواب سُن کر جان کے ہونٹوں پر حقارت کا ایک تبسم پیدا ہوا اور وہ نڈر ہو کر کہنے لگا۔

"تم جادُوگر ہو یا شیطان، ہمیں اِس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم تو یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تم آخر اس جنگل میں کیوں پھر رہے ہو۔ تمہارا یہاں کیا کام؟"

"ارے صاحب کمال کرتے ہیں۔ جنگل کوئی آپ کا ہے؟ یا آپ نے اس جنگل میں دوسروں کو داخل ہونے سے روک رکھا ہے! میری مرضی جہاں دِل چاہے گا جاؤں گا۔ آخر میں جادوگر ہوں اور میرا کام۔۔۔"

"سنو اجنبی!" عبدل نے پھر گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہا:

"جادو وادو کو تو ہم مانتے نہیں۔ صاف صاف کہو تم کیا کہنا چاہتے

ہو۔۔۔؟‘‘

’’حیرت ہے!‘‘کُبڑے نے ہنس کر کہا:

’’میں تو کُچھ بھی کہنا نہیں چاہتا، آپ ہی لوگ زبردستی پوچھ رہے ہیں، اب رہی یہ بات کہ میں جادوگر ہوں یا نہیں تو لیجیے میں آپ کو چند باتیں بتاتا ہوں۔ ذرا غور سے سنیے۔‘‘

اتنا کہہ کر وہ آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے، کُچھ دیر تک مُونہہ ہی مُونہہ میں بڑبڑاتا رہا اور پھر آنکھیں کھول کر ہم کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد آہستہ سے کہنے لگا:

’’چونکیے گا مت۔۔۔ لیجیے سنیے، آپ جو میرے سامنے بندوق تانے کھڑے ہیں، امریکہ سے آئے ہیں اور آپ کا نام جان ولیم ہے، اچھّے دِل

کے آدمی ہیں، جن صاحب کے ہاتھ میں مُڑا ہوا چاقو ہے، وہ مِصری ہیں، اور ان کا نام عبدل ہے، یہ آپ کے دوسرے ساتھی ہیں۔ تیسرے صاحب جیک ہیں، افریقہ سے آئے ہیں۔ رہ گیا وہ ننّھا سا چوہا۔ ۔ ۔"

اُس نے میری طرف اشارہ کیا۔ سچ بات یہ ہے کہ اچانک یہ خطاب سُن کر میرا خون کھولنے لگا، مگر مصلحت اسی میں تھی کہ خاموش رہتا، اس لئے کُچھ نہیں بولا۔

"رہ گیا وہ ننّھا سا چوہا۔ ۔ ۔" کُبڑے نے ہنس کر کہا:

"تو اِسے آپ دِلّی سے لے کر آئے ہیں، غریب لڑکا ہے بے چارہ اور اس کا نام فیروز ہے۔ یہ تو ہوا آپ سب کا تعارف۔ اب یہ سنیے کہ آپ لوگ کیوں اس جنگل میں آئے ہیں؟ مسٹر جان، آپ کے پاس ایک خزانے کا نقشہ ہے جو اسی جنگل میں کہیں دفن ہے۔ خزانہ پانے کے بعد

آپ لوگ ایک نامعلوم جزیرے میں جائیں گے۔ یہ جزیرہ صرف چودھویں رات کو، جب کہ چاند پورا ہوتا ہے، سمندر میں سے نمودار ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

کُبڑا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ گویا ہمارے چہروں سے ہمارے دِلوں کا راز جان لینے کا خواہش مند تھا۔ میرے ساتھ ساتھ سب ہی حیرت زدہ تھے۔ سب تعجّب سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اس کا جادُو بالکل سچّا معلوم ہوتا تھا، اسی پر بس نہ کر کے اس نے پھر کہنا شروع کیا:

"اب یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ آپ اس جزیرے میں کیا تلاش کرنے جا رہے ہیں؟ سنیے جناب، وہ ایک عجیب سی دیوزاد مکّھی ہے جس کا قد اونٹ سے بھی اونچا ہے، لمبائی میں وہ گینڈے سے بھی لمبی ہے، ہاتھی جتنی موٹی ہے، اس کے پَر معلوم ہوتا ہے کہ دو بڑے ہوائی جہاز ہیں۔ اس کی ناک

سے شعلے نکلتے ہیں۔ وہ بے حد خطرناک ہے اور سمندر میں رہتی ہے۔
صرف چاند رات کو جب کہ جزیرہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوتا ہے، وہ شکار کی
غرض سے ہوا میں اُڑتی ہے، اُسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ اس
کے بارے میں صرف سُنا ہی ہے مگر اس پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اتنی
خطرناک ہونے کے باوجود وہ بہت کارآمد ہے۔ اُس کی آنکھیں اگر احتیاط
سے نکال لی جائیں تو چھُپے ہوئے دفینوں کو خود بخود زمین میں سے کھینچ کر
باہر نکال لیتی ہیں۔ اُن آنکھوں میں یہی تاثیر ہے۔ ایک کام اُن آنکھوں
سے اور بھی لیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر اس مکھّی کی آنکھوں کے
آگے کوئی سی بھی چیز رکھ دی جائے تو وہ سونا اور ہیرا بن جاتی ہے۔ پتھّر
ہیرے بن جائیں گے اور دھاتیں سونا۔ اسی لیے آپ اس جزیرے میں
جانا چاہتے ہیں۔۔۔ فرمائیے، میں نے کوئی بات غَلَط تو نہیں کہی؟"

اتنا کہہ کر وہ خطرناک کُبڑا بالکل خاموش ہوگیا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی
مُجھے ایسا محسوس ہوا گویا جنگل کے ان نظر نہ آنے والے ٹڈّوں کا شور اب
یک لخت کم ہوگیا ہے، جن کی آوازوں سے کُچھ دیر پہلے پورا جنگل گونج رہا
تھا۔ ہوا کی سائیں سائیں بھی اچانک رُک گئی ہے اور اس خاموشی میں اب
صرف ہمارے دِلوں کی دھڑکن صاف سُنائی دے رہی تھی۔ میں نے
حیرت بھری نظروں سے اپنے مالک جان کی طرف دیکھا۔ کیا بتاؤں آپ
کو کہ اس کی اس وقت کیا حالت تھی؟ چہرہ بالکل زرد تھا اور وہ بالکل گُم سُم
کھڑا تھا۔ اس کی حالت بتاتی تھی کہ جس راز کو اس نے ہر ایک سے چھپایا
اب اس کے ظاہر ہو جانے سے اُسے بہت زیادہ دُکھ پہنچا ہے۔ جیک اور
عبدل بھی آنکھیں پھاڑے حیرت سے اس اجنبی کُبڑے کو دیکھ رہے
تھے۔ مگر میرا دِل اندر سے کہتا تھا کہ جیک کی وہ حیرت بناوٹی تھی۔ جو وہ

اندر سے تھا باہر سے ہر گز نظر نہ آتا تھا۔ جان اور عبدل کے اس طرح حیرت زدہ ہو جانے سے ایک بات تو کم از کم میری سمجھ میں آ گئی اور وہ یہ کہ کُبڑا جادوگر جو کُچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ سچ مچ جادُو جانتا ہے۔ کافی دیر تک تو جان خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ آخر پھر اطمینان کی ایک لمبی سانس لینے کے بعد آہستہ سے بولا :

"میں جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ مُجھے اعتراف ہے کہ تم جو کُچھ کہہ رہے ہو بالکل سچ ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس سے تمہیں کیا۔ اگر واقعی ہم لوگ خزانے کی تلاش میں جا رہے ہیں تو تم دخل دینے والے کون ہو؟ خواہ مخواہ ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے آخر تمہارا مطلب کیا ہے ؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" عبدل نے بھی اپنی لمبی گردن جھٹک کر کہا۔

"آخر یہ کہانی سُنانے سے تمہارا مطلب کیا ہے؟" جیک نے دانت پیس کر پوچھا۔

"مطلب تو صاف ظاہر ہے۔" کُبڑے نے مُسکرا کر کہا:

"میں صرف خزانے کا وہ نقشہ چاہتا ہوں جسے مسٹر جان نے تیّار کیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔" جان صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا، لیکن عبدل نے کہا:

"ہر گز نہیں، وہ نقشہ تمہیں ہر گز نہیں مل سکتا۔ تم اسے نہیں لے جاسکتے۔"

"مُجھے کوئی نہیں روک سکتا، وہ نقشہ میں ضرور لے جاؤں گا۔" کُبڑے نے ڈھٹائی سے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خطرناک مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

میں خاموش کھڑا ان لوگوں کی باتیں سُن رہا تھا اور دِل ہی دِل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ایک بڑا سا پتھرّ اُٹھا کر اس

کُبڑے کی ٹانگ پر جما دوں۔ اِس منحوس شخص کی مُسکراہٹ مجُھے بُری طرح کھِل رہی تھی، آخر مجُھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے یہ خیال بھی نہ کیا کہ اپنے مالکان کی موجودگی میں میرا بولنا ٹھیک نہیں ہے، لہٰذا بس جلدی سے آگے بڑھ کر اس کُبڑے جادوگر سے پوچھ ہی لیا:

"اگر تم جادوگر ہو تو پھر تمہیں نقشے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اپنے جادُو کے زور سے کیوں یہ معلوم نہیں کر لیتے کہ خزانہ کہاں ہے؟"

میری یہ بات سُن کر میرا مالک جان مُسکرانے لگا اور اس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی اور پھر خوشی ظاہر کرنے کے لئے اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ عبدل نے بھی میرے اس سوال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ البتّہ جیک کے بھیانک چہرے پر خفگی کے آثار نظر آنے لگے۔ ایک لمحہ کے لیے تو میرا یہ سوال سن کر وہ جادُوگر بھی چکرا گیا، لیکن پھر جلدی سے

اپنی حالت پر قابو پا کر مُسکرایا اور بولا :

"یہ ننّھا چوہا تو کافی عقل مند معلوم ہوتا ہے ! کیوں نہ ہو، آخر ہمارے ہندوستان ہی کا ہے ۔ اس نے سوال تو اچّھا کیا ہے لیکن میرے پاس اس کا جواب بھی موجود ہے ۔"

اتنا کہہ کر اب وہ مُجھ سے مخاطب ہوا :

"سنو لڑکے تمہارا نام فیروز ہی ہے نا؟ شاید میں نے تمہارا یہی نام بتایا تھا ۔ خیر جو کُچھ بھی ہو ۔ تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ تم نے الہ دین اور جادُو کے چراغ کی کہانی تو پڑھی ہوگی ۔ اس میں جادُوگر الہ دین کو ایک غار میں لے جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ اکیلا غار کے اندر جا کر جادُوئی چراغ لے کر آئے ۔ صرف الہ دین ہی وہ چراغ لا سکتا تھا ۔ جادوگر اپنے جادُو کے زور سے نہیں منگوا سکتا تھا ۔ کُچھ ایسی ہی حالت میرے ساتھ بھی

ہے، میں دُنیا میں ہر ناممکن بات کو مُمکن بنا سکتا ہوں، لیکن بس صرف دفینوں کے بارے میں نہیں جان سکتا۔ میرا جادُو یہاں آکر بے کار ہو جاتا ہے، سمجھ گئے؟"

بات اس نے ایسی معقول کہی تھی کہ مُجھے جواب نہ بن پڑا اور میں پھر دوبارہ جلدی سے جان کی کمر کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ کُبڑا تھوڑی دیر تک عجیب نظروں سے ہر ایک کو باری باری دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

"ہاں تو مسٹر جان، لائیے وہ نقشہ۔ اب میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔"

"لیکن میں وہ نقشہ تمہیں ہر گز نہیں دوں گا۔" جان نے بندوق مضبوطی سے پکڑ کر جواب دیا۔

"آپ ضدّی آدمی ہیں، لیکن خیر کوئی بات نہیں، میں آپ کو کل تک کا

وقت دیتا ہوں۔ اب رات ہونے والی ہے، کل صُبح مُجھے آپ کا جواب

مل جانا چاہیئے جس کے بارے میں مُجھے یقین ہے کہ 'ہاں' میں ہی ہو گا۔

اچھّا میں اب چلتا ہوں، کل ملاقات ہوگی۔"

اتنا کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑا مگر پھر اچانک رُک کر کہنے لگا۔ "اور ہاں،

بھاگنے کی کوشش مت کیجیئے گا، آپ لوگ مُجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے۔"

کُبڑا تو اتنا کہہ کر چلا گیا، مگر ہم سب کو عجیب کشمکش کی حالت میں چھوڑ گیا،

بڑی دیر تک ہم خاموش رہے۔ آخر جان نے اس خاموشی کو توڑتے

ہوئے کہا:

"رات اب قریب ہی ہے، اس لیے بہتر ہے کہ ہم اپنے خیمے لگا لیں

میرے خیال میں یہ جگہ خیمے گاڑنے کے لیے بالکل ٹھیک ہے۔"

یہ سُن کر میں نے جلدی سے خچروں کی کمر سے بندھا ہوا سامان اتارا اور خیمے نکال کر انہیں جلدی جلدی زمین پر پھیلایا۔ اس کام میں میری مدد عبدل نے بھی کی۔ ہم دونوں نے مل کر خیمے گاڑ دیے اور پھر سامان ان کے اندر رکھ کر بستر بچھا دیے۔ ہر شخص اپنے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ خیمے ویسے بھی قریب قریب تھے لیکن اس کے باوجود بھی میں باری باری ہر خیمے میں جاتا رہتا تھا۔ میں آخر ان تینوں کا ملازم تھا اور ان کا خیال رکھنا میرے فرض میں شامل تھا۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے، ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ جنگل کے درمیان سے کبھی کبھار کسی درندے کی آواز آ جاتی تھی ورنہ ہر طرف خاموشی تھی۔ چاند ابھی پوری طرح نکلا بھی نہ تھا، ہلکی ہلکی ملگجی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس منحوس کُبڑے کو ہم سے جُدا ہوئے

تین گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے مگر ہمیں یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابھی گیا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوا کہ دیکھیے اب قسمت کیا گُل کھلاتی ہے اور آگے کیا پیش آتا ہے، عبدل کے خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر نکل آیا۔۔۔ چاند کافی اوپر آ چکا تھا اور جنگل کی ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ میری جیب میں ایک چھوٹا سا ہلکا پستول تھا، جسے میرے مالک جان نے مُجھے اپنی حفاظت کے لیے کُچھ دیر پہلے دیا تھا۔۔۔ اور جس سے نشانہ لگانے کی مشق میں اچھّی طرح کر چکا تھا۔ جنگل کی یہ ہیبتناکی دیکھ کر میرا دِل دھڑکنے لگا اور بے اختیّار میرا ہاتھ اپنے پستول پر گیا۔ ہلکے ہلکے قدم بڑھاتا ہوا میں جان کے خیمے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ اچانک دور جنگل میں ایک سائے کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کوئی مُجھے دیکھ کر جلدی سے ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ اس نئی بات کی اِطّلاع دینے کے لیے میں فوراً خیمے کے اندر پہنچا۔

میرا مالک جان اپنی بندوق کی نال صاف کر رہا تھا، مُجھے دیکھ کر کہنے لگا۔

"آؤ فیروز آؤ۔ میں تمہیں بلانے ہی والا تھا۔"

"فرمائیے! میں حاضر ہوں۔" میں نے ادب سے کہا۔

"بات یہ ہے فیروز! کہ میرا دِل آپ ہی آپ تمہاری طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ تم شاید خود کو میرا ملازم سمجھتے ہو لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ تم مُجھے اب اپنے بیٹے کی طرح عزیز ہو۔ تم نے اس نالائق کُبڑے سے بڑا اچھّا سوال کیا تھا۔ اب ذرا یہاں میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں ایک خاص بات بتاتا ہوں۔"

میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مُجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور جب میں بیٹھ گیا تو بولا۔

"سنو بیٹا۔ مُجھے اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ بھروسہ صرف تم پر ہے۔"

"جی مُجھ پر۔۔۔۔!"

"ہاں، اوراس کی وجہ یہ ہے کہ میں دراصل تم جیسے بے شمار بچّوں کا باپ ہوں، کئی سو بچّوں کا باپ۔ سمجھے؟"

"جی میں سمجھا نہیں۔"

"میں دراصل جو ہوں وہ میں ظاہر نہیں کرتا۔ تم شاید سمجھتے ہو گے کہ میں ایک لالچی انسان ہوں جسے خزانہ پانے اور اس مکھّی کی آنکھیں حاصل کرنے کی تمنّا ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ خزانہ مُجھے اپنے لیے نہیں چاہیئے، میری کوئی اولاد نہیں ہے.جس کے لیے میں اسے حاصل کرنے کی

فکر کروں۔ میں یہ چیزیں خُدا کے بندوں کی خدمت کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی میں سمجھ گیا۔"

"امریکہ میں اندھے بچّوں کا ایک اسکول ہے۔ اُسے میں ہی چلاتا ہوں، ایک یتیم خانہ اور بیوہ عورتوں کا چھوٹا سا گھر ہے۔ اس کا بار بھی مُجھے ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اس عجیب و غریب مکّھی کی آنکھوں میں ایک تاثیر یہ بھی ہے کہ اگر وہ آنکھیں اندھے لوگوں کی آنکھوں سے مِل جائیں تو ایک ہفتے کے اندر اندر ان کی بینائی واپس آ جائے گی۔ اس کُبڑے جادُوگر نے جو باتیں بتائی ہیں بالکل ٹھیک ہیں، مگر میں اس کے جادُو پر یقین نہیں رکھتا۔ کسی نہ کسی طرح اسے میرے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو گئی ہیں اور وہی اس نے مُجھے سُنا دی ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔"

"جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ "میں نے آہستہ سے کہا۔

"اب جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں وہ غور سے سنو۔ "اس نے ہلکی آواز میں کہنا شروع کیا:

"عبدل اور جیک دونوں میرے ساتھی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اچھّے انسان نہیں ہیں مگر مُجھے مجبوراً اس کام میں انہیں شامل کرنا پڑا ہے۔ ان دونوں کی مدد کے بغیر میں اتنے لمبے سفر پر روانہ نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہیں اب ان لوگوں سے ہوشیار رہ کر ان کی نگرانی کرنا ہو گی۔ ان کے ہر ارادے کی اِطّلاع مُجھے دینی ہوگی۔ سمجھ گئے؟"

"جی ہاں خوب سمجھ گیا۔"

"خزانہ مل جانے کے بعد میں کوشش کروں گا کہ اسے فوراً امریکہ روانہ کر

دوں۔ مُجھے ان یتیم اور اندھے بچّوں کا خیال بہت ستاتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کروں، کیوں کہ انسان صرف پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ دوسروں کے کام آئے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیے، میں آپ کی ہدایتوں پر پوری طرح عمل کروں گا۔ مگر اس وقت میں آپ کے پاس ایک بہت ہی ضروری خبر لے کر آیا ہوں۔"

"خبر۔۔۔؟" جان ایک دم چونک گیا۔

"جی ہاں! اہم خبر۔ اور وہ یہ ہے کہ یہاں خیمے میں آنے سے پہلے میں نے دور جنگل میں ایک پُراسرار سایہ دیکھا ہے۔ مُجھے دیکھ کر وہ درخت کی آڑ میں ہو گیا، خُدا جانے وہ کون ہے؟"

جان یہ سنتے ہی اُچھل پڑا۔ اس کے چہرے پر بے چینی صاف جھلکنے لگی۔ بڑی بے تابی کے ساتھ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ وہی منحوس کُبڑا ہو۔ فیروز ہمارے کئی دُشمن پیدا ہو چکے ہیں اور کئی اور پیدا ہو جائیں گے۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں تمہارا اعتبار کر لوں۔ تم ایک شریف اور ایمان دار لڑکے ہو۔ مُجھے اُمّید ہے کہ تم میرے اس اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔"

"میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ آپ ہمیشہ مُجھے اپنا وفادار پائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کے لیے تمہارا شکریہ!" اس نے کُچھ دیر خاموش رہ کر سوچنے کے بعد کہا:

”اچھّا لو، خزانے کا یہ نقشہ اب تم اپنے پاس رکھو۔ کسی کو بھی یہ خیال نہ ہو گا کہ نقشہ تمہارے پاس ہے اور سچ تو یہ ہے کہ میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ نقشہ صرف تمہارے پاس ہی محفوظ رہے گا۔ میں رات بھر اس کُبڑے کا انتظار کروں گا۔ وہ کسی وقت بھی خیمہ کا پردہ اٹھا کر اندر آ سکتا ہے۔“

نقشہ ایک چمڑے کے بٹوے میں بند تھا۔ میں نے یہ بٹوہ اپنی قمیض کے اندر والی جیب میں رکھ لیا۔ اچانک ایک ہیبت ناک آواز باہر سے آتی سُنائی دی۔ بڑی پُراسرار سنسناہٹ سی تھی، کسی کے بھاری قدموں کی چاپ۔ یہ آواز دھیرے دھیرے قریب آ رہی تھی۔۔۔ قریب۔۔۔ اور قریب! اور میں سوچ رہا تھا کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے؟

ہم دونوں سانس روکے خیمے کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں بُزدل نہیں ہوں، لیکن ایمان کی بات ہے کہ اس وقت میری روح بھی

فنا ہو رہی تھی۔ احتیاطاً میں نے اپنا ہاتھ اپنے پستول پر رکھا ہوا تھا اور میرا مالک جان سہمی ہوئی نظروں سے دروازے کو دیکھے جا رہا تھا۔ پردے کو ذرا سی حرکت ہوئی۔ ایک سوکھے سے مریل ہاتھ نے پردہ ایک طرف سرکایا اور پھر آواز آئی:

"میں اندر آ رہا ہوں مسٹر جان، اجازت مانگنے کی مُجھے ضرورت نہیں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ دونوں میرے ہی انتظار میں یوں ڈرے اور سہمے کھڑے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟"

اس میں کوئی شک نہیں آواز کُبڑے جادُوگر کی تھی۔ اپنے ہونٹوں پر وہی بھیانک مُسکراہٹ پیدا کیے، عجیب سی خوفناک نظروں سے وہ ہمیں گھور رہا تھا۔

جان نے ہلنے کی کوشش کی تو فوراً وہ بولا۔

”نہ۔۔۔نہ۔۔۔۔۔ایسی حرکت مت کیجئے، میں جانتا ہوں کہ آپ دونوں مسلح ہیں، مگر میرے حضور، ایک حقیر سا پستول تو اس خاکسار کے پاس بھی موجود رہا کرتا ہے۔ اور ذرا غور سے دیکھئے، وہ پستول خادم کے کوٹ کی جیب میں سے پہلے ہی آپ دونوں کو جھانک رہا ہے۔“

اتنا کہہ کر اس نے پھر وہی بھیانک قہقہہ لگایا جس سے میری جان جلتی تھی۔ عجیب ہنسی تھی، معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چھچھوندر کسی بل سے بول رہی ہو۔ ہنستے وقت وہ دوہرا ہو جاتا تھا اور تب اس کا کُب بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا تھا، جیسے ہی وہ ہنستے ہنستے نیچے جھکا میں نے موقع غنیمت جان کر جلدی سے اپنا چھوٹا سا پستول باہر نکال لیا۔ میں نے یہ بھی پروا نہ کی کہ اپنے مالک کی موجودگی میں مُجھے اپنا پستول نہیں نکالنا چاہیے، بس اچانک ہی یہ حرکت سرزد ہو گئی۔ پستول کا رُخ اپنی طرف دیکھ کر وہ کہنے لگا :

"اوہو۔۔ ننھّے چوہے تُم نشانے کی مشق کرنا چاہتے ہو! مُجھ جیسے بڑے جادُوگر پر گولی چلانا چاہتے ہو! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ گولی مُجھ پر اثر نہیں کر سکتی۔ جان صاحب آپ نے اچھّا ملازم رکھا ہے، جو ذرا سی بات پر پستول نکالتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میرے آدمی باہر کھڑے ہیں۔ گولی چلتے ہی وہ آپ لوگوں کو زندہ نہ چھوڑیں گے اس لیے مہربانی کر کے اپنے اپنے پستول زمیں پر ڈال دیجیے، دیکھئے جلدی کیجئے میری پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

جان نے مُجھے اور میں نے جان کو دیکھا۔ آخر مجبوراً ہم دونوں نے اپنے اپنے پستول نکال کر زمین پر پھینک دئیے۔ اس منحوس کُبڑے نے وہ پستول اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے کافی دور پھینک دیے اور پھر اپنا پستول جیب سے نکال کر ہم دونوں کو نشانہ بناتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں تو سر کار اب سیدھی طرح وہ نقشہ نکال کر مُجھے دے دیجئے۔"

"نقشہ۔۔۔۔۔۔۔!" جان نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"جی ہاں نقشہ۔ معمولی سا نقشہ۔"

"مگر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب تم نے ہمیں کل رات تک کی مہلت دی تھی تو پھر اب اسی رات کو تم ہمارے خیمے میں کیوں آ گئے؟"

"صاحب بات یہ ہے کہ بڑے آدمیوں کا اعتبار ذرا کم کیا کرتا ہوں۔" اس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہنے لگا: "کون جانے اس عرصے میں آپ خزانہ کہیں چھپا دیتے، کہیں زمین میں دفن کر دیتے یا اپنے اس چوہے کے ہاتھ کہیں بھیج دیتے۔"

"خبر دار۔۔۔۔۔۔!منہ سنبھال کر بات کرو۔ تم مجھے بار بار چوہا کیوں کہتے

ہو؟"میں نے طیش میں آ کر پوچھا۔

"واہ بھئی" اس نے ہنس کر کہا۔ "دِن کو تو میں دِن ہی کہوں گا رات کو رات،
اب تمہیں چوہا نہ کہوں تو کیا کہوں؟ تم کل آئینے میں اپنی شکل دیکھنا بالکل
چوہا نظر آتے ہو۔"

"اور تم چھچھوندر۔"میں نے غصّے سے کہا۔

"میں اس نئے خطاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"اس نے جھک کر کہا۔

"خُدا نے مُجھے کُبڑا بنا کر ہر قسم کا خطاب برداشت کرنے کی طاقت دی دی
ہے، میں اس خطاب کا بُرا نہیں مانتا۔"

بہت ہی ڈھیٹ تھا کم بخت، جس انداز اور جس طریقے سے وہ طنزیہ باتیں
کرتا تھا میرا جی جل جاتا تھا، انہیں سن کر۔ میرے چہرے کو خوب غور

سے چند بار دیکھنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

"ہاں تو صاحب یہ باتیں بعد کے لیے اٹھا رکھیے، اب ذرا مطلب کی بات کیجئے، بولیے مسٹر جان، وہ نقشہ کہاں ہے؟ لائیے، مُجھے جلدی دیجئے میرا ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔"

"نقشہ میرے پاس نہیں ہے۔" جان نے مُسکرا کر کہا۔

"آپ کے پاس نہیں تو پھر کس کے پاس ہے؟"

"یہ مُجھے نہیں معلوم، میں شروع ہی سے اس قسم کا کوئی نقشہ لے کر نہیں چلا تھا۔" جان نے جواب دیا۔ اب وہ نڈر ہو کر بات کر رہا تھا۔

"جھوٹ مت بولیے، مُجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ سیدھی طرح بتائیے کہ نقشہ کہاں ہے؟"

جان تو خاموش رہا۔ مگر میں نے سینہ تان کر کہا :

"جب وہ تم سے کہہ چکے ہیں کہ نقشہ ان کے پاس نہیں ہے، تو پھر کیوں انہیں پریشان کر رہے ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو۔"

کُبڑے جادوگر نے یہ سن کر میری آنکھوں میں غور سے دیکھا اور پھر حقارت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"انہیں پریشان تو میں اس لیے کر رہا ہوں کہ وہ سچ بات خود اپنے منہ سے کہہ دیں، مگر خیر کوئی بات نہیں، وہ اگر نہیں بتانا چاہتے تو میں خود معلوم کر لوں گا کہ نقشہ کہاں ہے؟"

"ضرور ضرور، آخر تمہارا جادُو کس دِن کام آئے گا؟" میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”لڑکے!“ کُبڑے کے چہرے پر اچانک زبردست غصّے کے آثار نمودار ہو گئے، اور وہ خوفناک آواز میں بولا:

”میں بار بار کہتا ہوں کہ تو اور تیرا مالک میری قوّت سے واقف نہیں ہیں، میرا جادُو بتاتا ہے اور میں اچھّی طرح جانتا ہوں کہ خزانے کا نقشہ کس کے پاس ہے۔“

”جب تمھیں معلوم ہے تو جا کر خود اس سے لے لو۔ ہمارا دماغ کیوں کھا رہے ہو؟“ میں نے مُسکرا کر کہا، اسے جلا کر مجھے مزا آ رہا تھا۔

”رحم! رحم! اے دیوتا! تُم نے کیوں میرے دِل میں یہ رحم پیدا کر دیا ہے؟“ اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہنا شروع کیا: ”تمھارا منظورِ نظر چیتن کیا اسی لائق ہے کہ اس لڑکے جیسے معمولی چوہے اس کا مذاق اڑائیں۔“ اس نے اتنا کہہ کر مجھے پھر غور سے دیکھا اور کہا۔

"میری طاقت دیکھنا چاہتا ہے، تو دیکھ، اب میں تُجھے اپنے جادُو کا کرشمہ دِکھاتا ہوں، تم بھی دیکھو جان! تم سمجھتے تھے کہ نقشہ محفوظ ہے لیکن اب وہ میں چند سیکنڈ ہی میں اس حقیر چوہے سے حاصل کرلیتا ہوں، کیوں کہ وہ اسی کے پاس ہے۔"

اس نے اس گفتگو کے بعد پھر بھیانک قہقہہ لگایا، میں نے چونک کر جان کو دیکھا، اس کا چہرہ اب بالکل پیلا پڑ گیا تھا اور وہ خوفزدہ نظروں سے میرے منہ کو تک رہا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا فیروز؟" جان نے کہنا شروع کیا: "میں نے غَلَطی کی جو تم پر اعتبار کیا۔ اب شاید تم نادم ہو گے، تم نے خواہ مخواہ ہماری گفتگو میں حصّہ لے کر اس احمق کُبڑے کو اپنی طرف متوجّہ کرلیا، تمھیں معلوم نہیں کہ یہ دوسروں کے چہرے دیکھ کر ان کے دِلوں کا حال پڑھنا خوب جانتا

ہے، بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی کی باتوں کے درمیان مت بولو۔ کاش تم اس پر عمل کر کے خاموش ہی رہتے۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"کُچھ بھی نہیں کہہ سکتے، مسٹر جان!" کُبڑے جادُوگر نے مُسکرا کر کہا۔ "اس لڑکے میں یہی تو ایک عیب ہے، چھٹانک بھر کا چھوکرا اور باتیں بڑی بڑی بناتا ہے، واقعی اگر یہ خاموش رہتا تو مُجھے مشکل ہی سے یہ بات معلوم ہوتی کہ نقشہ اس کے پاس ہے، گو میرا جادُو مُجھے بعد میں یہ بتا دیتا لیکن اتنا معلوم کرنے کے لئے مُجھے بڑی محنت کرنا پڑتی، خیر کوئی بات نہیں، لاؤ بیٹے اب تم وہ نقشہ مُجھے دے دو۔"

"تو کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ نقشہ کس چیز میں بند ہے۔" میں نے پژمُردہ آواز میں کہا، میں جان کی باتیں سن کر افسردہ ہو گیا تھا۔

"کیوں نہیں، نقشہ ایک چمڑے کے بٹوے میں بند ہے اور تم نے اسے

کہیں چھپا رکھا ہے۔"

"آپ بتا سکتے ہیں کہ کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"اب میں یہ دردِ سری کیوں مول لوں۔ جب مُجھے معلوم ہے کہ نقشہ تمہارے پاس ہے تو ظاہر ہے وہ تم نے اپنی قمیص میں کہیں چھپا رکھا ہو گا، لاؤ اب جلدی کرو، پہلے ہی کافی رات ہو چکی ہے اور ابھی مُجھے بہت دور جانا ہے۔"

کُبڑے نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا بالکل میرے قریب آ گیا۔ جان کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے کچا کھا جائے، مگر غریب مجبور تھا، پستول کی نال اس کی طرف تھی، میں بالکل خاموش کھڑا تھا، کُبڑے نے میرے پاس آ کر کہا۔

"اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔"

میں نے مجبوراً ہاتھ اوپر اٹھا لئے، اس کے بعد وہ مردود پستول کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی ذرا سا ہلتا تو پستول کی گولی ایک ہی وقت میں ہم دونوں کو زخمی کر سکتی تھی۔ شرم کے مارے میری نگاہیں نیچی تھیں اور جان کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس ظالم کُبڑے نے اپنے الٹے ہاتھ سے میری تلاشی لی۔ جب باہر کی جیبوں میں اسے کُچھ نہ ملا تو پھر اس نے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ چمڑے کا بٹوہ نکال لیا۔ بٹوہ نکلتے دیکھ کر جان کی رہی سہی ہمّت بھی جاتی رہی اور پریشان ہو کر اس نے منہ پھیر لیا۔ ایسا لگتا جیسے اس کی ٹانگوں میں کھڑے رہنے کی سکت نہ رہی ہو۔

بٹوے پر قبضہ کرتے ہی کُبڑا جادُوگر حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ پیچھے ہٹا

اور پستول کا رخ بدستور ہم دونوں کی طرف رکھتے ہوئے اس نے الٹے ہی ہاتھ سے بٹوہ کھولا۔ ساتھ ہی وہ کہنے لگا۔

"بڑے ہوشیار بنتے تھے جان۔ خزانے کا نقشہ اپنے ملازم کے پاس رکھ کر تم یہ سمجھتے تھے کہ میں نقشہ نہیں پاسکوں گا، مگر۔۔ ارے یہ کیا؟"

اس نے چونک کر بٹوے کے اندر جھانکا، اس کے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس کی پوری توجّہ بٹوے کی طرف لگ گئی اور وہ بار بار بٹوے کو ہلا ہلا کر دیکھنے لگا۔ وہ اپنے اس کام میں اتنا منہمک ہوا کہ پستول بھی اس سے ٹھیک طرح پکڑا نہ جا سکا، بٹوے کو اُلٹا کر کے اور اس کو تھپتھپا کر وہ اس انداز سے زمین کو دیکھنے لگا گویا نقشہ بٹوے کے کسی پوشیدہ کونے سے نکل کر اب وہاں جا پڑے گا۔ میرے لیے یہی موقع تھا، کُبڑا جادُوگر یہ بالکل بھول چکا تھا کہ اس نے کُچھ پہلے اپنے پستول سے ہم

دونوں کو نشانہ بنا رکھا تھا۔ بار بار بٹوے کو ہلا رہا تھا اور اس میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار جیسے ہی اس نے بٹوے کے اندر جھانکا میں نے اپنی جگہ سے جست کی اور ایک زور دار ہاتھ اپنی پوری قوّت سے کُبڑے جادُوگر کے پستول پر مارا، پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جان کے قدموں میں جا پڑا، جان کو خود حیرت تھی کہ یہ سب کُچھ کیا ہو رہا ہے؟ بٹوے میں نقشہ رکھ کر اس نے مُجھے خود دیا تھا اور نقشہ اب بٹوے میں موجود نہیں تھا، مگر یہ وقت حیرت کرنے کا نہیں تھا، وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے جلدی سے پستول پر قبضہ کر لیا اور پھر کھڑے ہو کر اس کا رُخ کُبڑے جادوگر کی طرف کر دیا۔

کُبڑا خونخوار نظروں سے مُجھے گھور رہا تھا، کیوں کہ اس کی توقّع کے خلاف میں بہت زیادہ ہوشیار ثابت ہوا تھا۔ وہ خواب میں بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ

میں اس کے لیے اس قدر خطرناک بن جاؤں گا، اسے احمقوں کی طرح اپنی طرف تکتے دیکھ کر میں نے کہا۔

"کہیے حضور جادُوگر صاحب۔ آپ کی جادُوگری کیا ہوئی، چوہا وقت آنے پر شیر بھی بن سکتا ہے، یہ آپ نے دیکھ لیا نا۔ آپ تو خزانے کا نقشہ لینے آئے تھے، اب آپ تشریف لے جائیے ورنہ خواہ مخواہ آپ کا اپنا پستول آپ کے حق میں بُرا ثابت ہو گا۔"

"میں جاتا ہوں۔ "کُبڑے نے کھا جانے والی نظروں سے مُجھے دیکھ کر کہا:
"مگر میں اس کا انتقام زبردست لوں گا۔ تم نے مُجھ سے دھوکا کیا"

"دھوکا۔۔۔ کیسا دھوکا؟ حضور دھوکا تو آپ کے جادُو نے آپ سے کیا ہے۔ جب آپ کو معلوم تھا کہ بٹوہ میرے پاس ہے تو کیا آپ اپنے جادُو کے زور سے یہ معلوم نہیں کر سکتے تھے، کہ وہ بٹوہ خالی بھی ہے۔"

"خیر ان باتوں کو چھوڑو، تم مُجھے صرف اتنا بتا دو کہ نقشہ تم نے کہاں چھپا کر رکھا تھا۔ میں فوراً چلا جاؤں گا، سچ کہتا ہوں ایک منٹ اس خیمے میں نہیں رہوں گا۔"

"اجی حضرت بٹوہ شروع سے تھا ہی خالی، آپ کو بے وقوف بنانے کے لیے ہم نے یہ اداکاری کی تھی۔"

میں نے اتنا کہہ کر جان کی طرف دیکھا وہ میرے اس جھوٹ سے اتنا خوش تھا کہ خوشی کے مارے اس کے ہاتھ بری طرح کپکپانے لگے۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو، سچ سچ بتا دو۔" کُبڑے نے کہا، اس کی آنکھوں میں میرے خلاف نفرت ہی نفرت دِکھائی دیتی تھی۔

"اگر تم اسے جھوٹ سمجھتے ہو تو میں تمھیں سچ بتا دیتا ہوں۔ نقشہ میں نے

ایک سیپ میں بند کر کے سمندر میں پھینک دیا تھا، وہ سیپ ایک مچھلی نے نگل لی اور اس مچھلی کو ایک بڑی مچھلی نے نگل لیا۔ بڑی مچھلی سمندر کی تہہ میں رہتی ہے اور وہیں اس کے پیٹ میں وہ نقشہ محفوظ ہے۔"

میرے اس مذاق سے کُبڑے کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور وہ اپنا پاؤں زمین پر پٹختے ہوئے کہنے لگا۔

"اچھّا میں سمجھ گیا کہ تم بتانا نہیں چاہتے، خیر کوئی بات نہیں۔ ایک ہی دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر اچھّا نہیں ہوتا۔ میں خزانے کا نقشہ ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔ اب تو میں جاتا ہوں لیکن پھر آؤں گا۔ میں تمہیں چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔"

"تم جاتے ہو یا پھر میں پستول استعمال کروں؟" جان نے ذرا سخت آواز میں کہا۔

ہم دونوں کو باری باری دیکھنے کے بعد وہ منحوس کُبڑا خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی میں نے اپنا چھوٹا سا پستول اٹھا کر جیب میں رکھا اور اپنے مالک جان کا ہاتھ پکڑ کر خیمے کے دوسرے دروازے سے باہر نکلا۔ جان نے کُچھ پوچھنا چاہا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ جان نے کُچھ نہیں کہا، حیرت سے مُجھے دیکھنے لگا۔

خیمے سے باہر آ کر ہم دونوں تیزی سے جنگل میں مخالف سمت بڑھنے لگے۔ جان بہت حیران تھا، مگر بے چارہ میری وجہ سے بالکل ہی خاموش تھا۔ ہم دونوں جھاڑیوں، ٹیلوں اور گڑھوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اور انہیں پھلانگتے ہوئے خیمے سے کوئی چار فرلانگ دور نکل آئے۔ یہاں چاند کی ہلکی روشنی گھنے جنگل کی وجہ سے بالکل ہی مدھم ہو گئی

تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بہت بڑا درخت تھا۔ میں اس درخت کی آڑ میں جلدی سے جا کر چھُپ گیا۔ پلٹ کر پیچھے دیکھا تو دور دور تک کسی آدمی کا نام و نشان نہ تھا، جان اب بھی حیران تھا، مگر میری وجہ سے بولنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ مُجھے یقین ہے کہ اس کے دل میں ہزاروں سوال اٹھ رہے ہوں گے۔

چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد میں نے یہ سُننے کی کوشش کی کہ کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں آ رہا؟ یا کسی قسم کی کوئی آواز تو نہیں آ رہی؟ جب مُجھے اطمینان ہو گیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تو میں نے جان سے کہا۔

"ہاں اب آپ فرمائیے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"یہ۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟"

"آپ کو شاید حیرت ہے کہ آخر یہ سب کیا ہو گیا، نقشہ کیا ہوا۔ میں نے آپ کی بغیر اجازت کُبڑے پر کیوں پستول تان لیا اور پھر آپ کو کیوں، اس گھنے جنگل کے اندر لے آیا۔ آپ یہی سوچ رہے ہیں نا؟"

"ہاں فیروز، لیکن مُجھے تم پر اتنا اعتبار ہے کہ میں سمجھتا ہوں تمہاری ان حرکات کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے، پھر بھی میں وہ وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" جان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں نے جواب دینے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھ لینا بہتر سمجھا۔ جب مُجھے اطمینان ہو گیا کہ کوئی چھپ کر ہماری باتیں نہیں سن رہا ہے تو میں نے آہستہ سے کہا۔

"سنیے! بات اصل میں یہ ہے کہ جیسے ہی مُجھے اس بات کا عِلم ہوا کہ اب کُبڑا جادُوگر کسی بھی لمحے میں خیمے کے اندر آنے والا ہے، اور اندر آ کر وہ لازمی

ہمیں پستول دِکھا کر ہم سے نقشہ مانگے گا، اسی وقت میں نے سوچ لیا کہ اب مُجھے کیا کرنا ہے؟ میں نے فوراً ایک ترکیب سوچی اور اس پر عمل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا۔ کُبڑے کے اندر آتے ہی بغیر آپ کی اجازت کے اس پر پستول تان لینا بھی اصل میں اسی ارادے کی ایک کڑی تھا۔ مُجھے یقین تھا کہ کُبڑا مُجھ سے میرا پستول یا تو چھین لے گا یا پھر اسے زمین پر پھینک دینے کے لیے کہے گا۔ اور جیسا کہ آپ نے دیکھا ایسا ہی ہوا، پستول پھینک دینے کے بعد اس نے میری تلاشی لی اور بٹوہ حاصل کر لیا۔ مگر اس بٹوے میں کیا نکلا۔؟ تھوڑی سی خاک اور بس۔۔۔۔۔“

”یہی تو مُجھے حیرت ہے کہ بٹوے میں سے نقشہ کیوں نہیں نکلا؟“ جان نے جلدی سے پوچھا: ”بتاؤ! ایسا کیوں ہوا؟“

”نکلتا بھی کیسے جناب!“ میں نے مُسکرا کر جواب دیا:

"نقشہ تو میرے پستول کی نال میں رکھا ہوا تھا۔"

میرا مالک جان یہ سنتے ہی خوشی کے مارے ایک دم اچھل پڑا اور جلدی سے اس نے مُجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ جب اس نے اپنی اس مسرّت پر قابو پا لیا تو بولا۔

"لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر کُبڑا تم سے تمہارا پستول لے کر اپنی جیب میں رکھ لیتا، تب کیا ہوتا اور تم کیا کرتے؟"

"اس صورت میں ہمیں زبردستی اُس کی جیب سے وہ پستول نکالنا پڑتا۔ وہ اکیلا تھا اور ہم دو، کیا ہم مل کر اس پر قابو نہیں پا سکتے تھے، کم از کم ہمیں اتنا خطرہ تو ضرور مول لینا پڑتا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ بالکل ٹھیک کہتے ہو۔" جان نے جوش میں آ کر جواب دیا۔

"لیکن فیروزاب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

"دیکھیئے، میں بتاتا ہوں، نقشہ جب تک کُبڑے جادُوگر کو نہ ملے تب تک یہ ہمارے حق میں بہتر ثابت ہو گا، نقشے کے لالچ میں وہ کم از کم ہمیں مارنا پسند نہیں کرے گا۔ وہ کوشش یہی کرے گا کہ ہم زندہ رہیں، دوسری بات یہ کہ ہمیں اب ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہو گا۔ ہمیں اپنے ساتھیوں پر بھی آنکھیں بند کر کے بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے، لیکن ہم اب اس نقشے کو کہاں چھپائیں؟"

"اس کی ترکیب بھی میں نے سوچ لی ہے۔ آپ کے پاس کیا کوئی ایسی روشنائی ہے جو پانی میں بھی ویسی ہی رہتی ہے یعنی اگر اس پر پانی لگ جائے تو پھیلتی نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں۔ ہے تو سہی۔" جان نے جلدی سے جواب دیا۔

"بس تو پھر آئیے، خیمے میں واپس چلتے ہیں اور آدھی رات کے بعد ہم وہ روشنائی ٹارچ اور چند دوسری چیزیں لے کر یہاں واپس آتے ہیں۔"

"ان چیزوں کا تم کیا کرو گے؟"

"آپ کے خزانے کی حفاظت کا مُستقل انتظام۔ ایک ایسا انتظام جس سے آپ کے خزانے کو اب کوئی نہ چرا سکے گا۔ آئیے اب واپس چلیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کُبڑا ہماری غیر حاضری میں وہاں پہنچ جائے۔"

جان میرا ہاتھ پکڑ کر درخت کی آڑ میں سے نکلا اور پھر ہم دونوں آہستہ آہستہ اپنے خیموں کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر جیسے ہی ہم نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔ یکایک سامنے جھاڑیوں میں ایک کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ ایک

عجیب سی آواز آئی اور ہم دونوں چوکنے ہو کر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے جھاڑیوں میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

جھاڑیاں اب آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ رات پہلے ہی اندھیری تھی، جنگلی جانوروں کی خطرناک آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ کیڑے مکوڑوں کے گھاس میں سرسرانے کی آوازیں بھی صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ مُجھے اب تک اتنے عجیب و غریب اور حیرت ناک واقعات پیش آ چکے تھے کہ شاید کسی نوعمر لڑکے کی زندگی میں پیش نہ آئے ہوں گے۔ میں ایک حد تک اب بالکل نڈر بن چکا تھا۔ مگر جھاڑیوں کے اس طرح ہلنے سے میرے دِل کی دھڑکن پھر تیز ہو گئی۔ خیال آیا کہ ہو نہ ہو وہی منحوس کُبڑا ہو گا، اپنی چیل جیسی آنکھوں سے اس نے ہمیں خیمے سے باہر آتے ہوئے دیکھ لیا ہو گا اور اب ہمارا تعاقب کرتے کرتے یہاں تک آ گیا

ہے، یہ سوچ کر میں نے آہستہ سے جان سے کہا۔

"میرے خیال میں یہ وہی کمبخت ہے۔"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" جان نے کنکھیوں سے ہر سمت میں دیکھا۔

"پھر کیا گولی چلا دوں؟"

"خواہ مخواہ، خون بہانے سے کیا فائدہ؟ پہلے یہ تو دیکھ لو کہ وہ کس ارادے سے آیا ہے؟"

"دیکھئے میں اسے للکارتا ہوں۔ اگر اس کا ارادہ خطرناک ہوا تو وہ جھاڑیوں سے باہر ہرگز نہ آئے گا۔" اتنا کہہ کر میں نے زور سے پکار کر کہا:

"سنو چیتن، اب تم کب تک ان جھاڑیوں میں چھپے رہو گے، بہتر ہو گا کہ باہر آجاؤ۔"

جواب تو کُچھ بھی نہ آیا، البتہّ جھاڑیاں اور زور سے ہلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر اب جان نے اپنی بندوق کا رُخ جھاڑیوں کی طرف کرتے ہوئے کہا :

"یوں چھپنے سے کُچھ فائدہ نہیں، تم باہر آ جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔ میں تین تک گنوں گا اس کے بعد بھی اگر تم باہر نہیں آئے تو نتیجہ کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

جان نے آہستہ آہستہ ایک سے تین تک گننا شروع کیا اور پھر جیسے ہی اس نے تین کہا، جھاڑیوں کو جنبش ہوئی اور پھر فوراً ہی کوئی چیز پھُدک کر ہماری طرف آئی، ہم دونوں گھبرا کر جلدی سے نیچے جھُک گئے۔ وہ چیز ہمارے سروں پر سے گزرتی ہوئی ہمارے پیچھے جا پڑی۔ ہم نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گئے، میں نے حیرت سے جان کو اور جان نے مجُھے دیکھا۔ مجُھے اب یہ حقیقت بیان کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے

کہ وہ کیا چیز تھی؟ آپ سب جو میری اس داستان کو شوق سے پڑھ رہے ہیں، یقیناً میری حماقت اور بُزدلی پر قہقہے لگائیں گے، بے شک لگائیے، میں آپ سے کوئی بات نہ چھپاؤں گا، جب میں اپنی بہادری کی داستان یوں مزے لے لے کر آپ کو سُنا رہا ہوں تو اپنی بے وقوفیاں بھی ضرور سناؤں گا۔

جس چیز سے ڈر کر ہم دونوں اچانک رُک گئے تھے اور جو جھاڑیوں میں سے اچھل کر ہماری طرف آئی تھی، دراصل سفید رنگ کا ایک خرگوش تھا، اسے پھُدک پھُدک کر جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ بعد میں ہم نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا، اور پھر احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھ کر خیموں کی طرف آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ چاند تھوڑی دیر کے لیے بادلوں میں سے نکلا اور ہم اس کی روشنی کو غنیمت جان کر جلدی جلدی خیموں کی طرف

بڑھنے لگے۔ جان نے اپنے خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر دیکھا احتیاطاً اس نے بندوق کی نال بھی سامنے کی طرف کر رکھی تھی۔ کون جانے کہ وہ کم بخت کُبڑا اندر بیٹھا ہوا ہم دونوں کا انتظار کر رہا ہو۔

مگر ہمارا یہ اندیشہ غَلَط ہی ثابت ہوا، اندر کوئی نہ تھا، میں نے فوراً ہر طرف نظر دوڑا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ہماری غیر حاضری میں خیمے کے اندر کوئی آیا تو نہیں تھا؟ پھر جلدی ہی مُجھے اطمینان ہو گیا کیوں کہ خیمے کی چیزیں جوں کی توں پڑی ہوئی تھیں۔ انہیں کسی نے ایک انچ بھی نہ سرکایا تھا۔

جان تب مُجھے چھوڑ کر جلدی سے اپنے سوٹ کیس کی طرف بڑھا۔ اسے کھولنے کے بعد اس نے اس میں سے ایک شیشی نکالی جس میں گہرے اُودے رنگ کی روشنائی بھری ہوئی تھی۔ شیشی میری طرف بڑھاتے

ہوئے اس نے کہا :

"لو بھئی یہ ہے وہ روشنائی، میں تو امریکہ سے ہی انتظام کر کے چلا تھا۔ بستر بند پر اور دوسرے سامان پر اس روشنائی سے میں نے اپنا نام اور پتہ لکھ دیا تھا۔ مُجھے معلوم تھا کہ میں ہندوستان جا رہا ہوں اور وہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بارش میں یہ نام اور پتہ دھل نہ جائے اس لیے میں نے یہ واٹر پروف روشنائی استعمال کی ہے۔ لیکن تم اس کا کیا کرو گے؟"

"شش!" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا، وہ خاموش تو ہو گیا مگر پھر حیرت سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا، اور جب اسے کوئی بھی آواز سُنائی نہ دی تو بولا۔ "کیا وہی کُبڑا ہے؟"

"جی نہیں" میں نے آہستہ سے جواب دیا : "لیکن راز کی باتیں ہمیں راز ہی رکھنی چاہئیں، آئیے اب وہیں جنگل میں چلیں، میں آپ کو وہاں سب کُچھ

بتاؤں گا۔"

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میرا مالک جان اب میرا بہت زیادہ اعتبار کرنے لگا تھا۔ بعض دفعہ تو مُجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس میں عقل بالکل ہی نہیں ہے اس لیے ہر بات میں مُجھ سے مشورہ لیا کرتا ہے، میں ایک معمولی سا نوکر، بھلا مُجھ سے مشورہ کرنے اور میرا کہا ماننے کی اسے کیا ضرورت تھی؟

بہرحال ٹارچ، بندوق اور روشنائی ساتھ لے کر ہم دونوں پھر دبے پاؤں خیمے سے باہر نکلے۔ آسمان پر اب بادل بالکل نہیں تھے، چاند کی تیز روشنی اب چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لمبے لمبے قد آور درخت دیوؤں کی طرح جگہ جگہ کھڑے تھے۔ پتّوں کی سرسراہٹ تیز ہو گئی تھی اور ماحول بڑا بھیانک ہو گیا تھا۔ میں جان کو وہیں چھوڑ کر جلدی سے دوسرے خیموں کی

طرف بڑھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جیک اور عبدل بھی اپنے اپنے خیموں میں موجود ہیں یا نہیں؟ مُجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ وہ دونوں اپنے خیموں میں گہری نیند سو رہے تھے، البتّہ کُبڑے جادُوگر کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہو گا، اور اس کی تیز مگر چیل جیسی آنکھیں اب بھی کہیں سے ہماری نگرانی کر رہی ہوں گی، مگر ہم مجبور تھے، ہمیں اپنا تو کام کرنا ہی تھا۔ اس لیے جلدی جلدی ہم دونوں جنگل میں اسی سمت بڑھنے لگے جہاں کُچھ دیر پہلے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر ہر قدم ہم چوکنّے ہو کر اٹھاتے۔ ایسا لگتا گویا کُبڑا اب آیا اور تب آیا۔ مگر خُدا کا شکر ہے ہمیں اس کی ذرا سی بھی آہٹ سُنائی نہ دی۔

درخت کے نیچے پہنچنے کے بعد ہم دونوں جلدی سے جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ یہ کام ہم نے اس لیے کیا تھا کہ اگر کُبڑا جادُوگر ہمارا پیچھا کرتا

ہوا اس طرف آ رہا ہو تو ہمیں پتہ لگ جائے۔ کوئی پندرہ منٹ تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ جب کسی بھی قسم کی کوئی آواز سُنائی نہ دی تو میں نے جان سے کہا : "اب ہم آہستہ سے باتیں کرسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، مگر تم یہ تو بتاؤ کہ تم کرنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آپ کے خزانے کی حفاظت کا مکمل انتظام کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا انتظام کہ پھر کوئی آپ سے نقشہ طلب نہیں کر سکتا۔"

"مگر کس طرح۔۔۔؟" جان نے حیرت سے کہا۔ "ایسا کیسے ہو گا؟"

"آپ پہلے روشنائی اور بُرش نکال لیجئے۔"

جان نے میرے کہنے پر اپنی جیب سے روشنائی اور برش نکال لیا، میں نے جلدی سے اپنی قمیض اتار ڈالی اور اپنی کمر کا رُخ اس کی طرف کرتے

ہوئے بولا۔ "اب آپ ٹارچ جلا کر خزانے کا پورا نقشہ میری کمر پر بنا دیجئے۔"

جان کو یہ سن کر اتنی حیرت ہوئی کہ برش اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ وہ تعجّب سے میری شکل دیکھنے لگا، لیکن ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں تعریف کی چمک بھی تھی۔ آخر کار وہ بولا۔

"فیروز! آخر تُم کون ہو؟ تُم روز بروز مُجھے حیرت میں ڈالتے جا رہے ہو۔ تم کوئی معمولی لڑکے نظر نہیں آتے۔ معمولی لڑکوں کے ذہن میں ایسی باتیں نہیں آیا کرتیں۔"

"آپ تعریف تو بعد میں کیجئے گا مگر پہلے یہ نقشہ میری کمر پر اتار دیجئے۔" میں نے جلدی سے کہا: "دُشمن ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

جان برش زمین سے اٹھانے کے بعد کُچھ دیر تک سوچتا رہا، میں نے اسے تذبذب میں دیکھ کر پوچھا: "کیوں آخر کیا بات ہے، کیا آپ کو مُجھ پر اعتماد نہیں ہے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو بیٹے؟" جان نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔۔۔ "کون ہے جس پر اب مُجھے سب سے زیادہ اعتماد ہو۔ میں تمہیں اب اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں۔ یہ میں تم سے بار بار کہہ چکا ہوں اور اپنے عزیز لڑکے سے میں نہ تو کوئی بات چھپا سکتا ہوں نہ ہی اس پر شک کر سکتا ہوں۔"

"پھر آخر کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا: "آپ سوچ کیا رہے ہیں؟"

"فیروز۔۔۔" جان نے تشویش ناک لہجے میں کہا:

"اس طرح تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ دُشمن کوشش کریں گے کہ کسی طرح تمہیں ختم کر دیں، اور تمہاری کمر سے یہ نقشہ نقل کر لیں، میں جان بوجھ کر تمہیں موت کے مُنہ میں دھکیلنا نہیں چاہتا۔"

"آپ کے ان جذبات کی میں قدر کرتا ہوں، اور آپ کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ آپ میرا اتنا خیال کرتے ہیں، مگر آپ میرا کہنا مان کر یہ نقشہ میری کمر پر نقل کر ہی دیجیے، اللہ نے چاہا تو میرا ذرا بھی بال بیکا نہ ہوگا، آپ کے سوا کسے معلوم ہوگا کہ نقشہ میری کمر پر بنا ہوا ہے؟ ہم اصل نقشہ تلف کر دیں گے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" جان نے ہار مانتے ہوئے کہا:

"ہاں مگر اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ اس طرح نقشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔"

اتنا کہہ کر اس نے ٹارچ کی روشنی میں جلدی جلدی نقشے کی نقل میری کمر پر بنانی شروع کر دی۔ مُجھے گدگدیاں محسوس ہونے لگیں مگر میں دِل پر جبر کیے بیٹھا رہا۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر ہی یہ کام ختم ہو گیا۔ قمیص دوبارہ پہننے کے بعد میں نے ٹارچ اور دوسری چیزیں اٹھائیں اور پھر جان کو ساتھ لے کر خیموں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

احتیاط کے طور پر ہم نے راستے میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ ہمیں ڈر تھا کہ اگر چیتن کہیں آس پاس موجود ہوا تو کہیں ہمارے مُنہ سے خزانے کی اس نئی حفاظت کے بارے میں کوئی لفظ نہ سن لے۔ کُچھ دیر بعد ہم اپنے خیموں کے پاس پہنچ گئے، جان کو باہر چھوڑ کر میں بلّی جیسے پاؤں رکھتا ہوا جیک کے خیمے کے قریب گیا۔ ایک چھوٹے سے سوراخ سے میں نے اندر جھانک کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آیا جیک بے

خبری کی نیند سو رہا ہے یا نہیں؟ کیوں کہ سچ بات یہ ہے کہ مُجھے جیک پر ابھی اطمینان نہیں ہوا تھا۔ اچانک میں چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاید آپ میری حیرت کا اندازہ نہ کر سکیں گے کہ میں نے کیا چیز دیکھی؟ جلدی سے میں اُلٹے پاؤں اپنے خیمے کی طرف واپس آیا اور جان کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر چلنے کے لیے کہا۔

خیمے کا پردہ اٹھا کر جیسے ہی ہم دونوں اندر داخل ہوئے، ایک نرالی بات ہمارے دیکھنے میں آئی۔ مُجھے چونکہ اس کا پہلے ہی سے یقین تھا اس لیے مُجھے زیادہ اچنبھا نہیں ہوا۔ ہاں البتّہ جان حیرت کے مارے جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ہمارے خیمے کا تمام سامان کسی نے اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے جلدی میں ہمارے پورے سامان کی تلاشی لی ہو۔ میں جانتا تھا کہ یہ کام اس منحوس کُبڑے کے علاوہ اور کسی

کا نہیں ہو سکتا۔

"دیکھا۔۔۔؟" جان نے مُجھ سے کہا۔ "کیا یہ کسی دُشمن کا کام نہیں ہے؟"

"جی ہاں، وہی احمق کُبڑا آیا ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔

"بجا فرمایا حضور نے، یہ کام آپ کے اس خادم ہی نے کیا ہے۔" ہمارے پیچھے سے وہی بھیانک آواز آئی، ہم نے پلٹ کر دیکھا تو دروازے میں چیتن کھڑا مُسکرا رہا تھا۔ ہاں مگر اس وقت اس کے ہاتھ میں پستول نہیں تھا۔ ہمیں حیرت سے اپنی طرف تکتے دیکھ کر اس نے پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"خادم کی اس حرکت سے آپ ضرور خوش ہوئے ہوں گے۔"

"بکواس بند کرو۔" جان نے غصّے سے کہا۔ "دوسروں کی غیر حاضری میں

ان کے سامان کی تلاشی لینا کہاں کی شرافت ہے؟"

"شرافت!" کُبڑا زور سے ہنسا۔ "میں تو شریف ہی نہیں ہوں اس لئے مُجھ میں شرافت کہاں، لیکن میں یہ اطمینان آپ کو ضرور دلا سکتا ہوں کہ میں نے آپ کے سامان میں سے ایک ننّھی سے سوئی تک نہیں نکالی، یہ دوسری بات ہے کہ سامان کو اچھّی طرح دیکھ ڈالا، کیوں دیکھ ڈالا۔۔۔؟ یہ آپ خود سمجھتے ہوں گے۔ مُجھے خزانے کے نقشے کی تلاش ہے، اور ظاہر ہے کہ وہ نقشہ مُجھے اس سامان میں نہیں ملا۔ مُجھے اس نقشے کی سخت ضرورت ہے، میں آپ سے بڑی نرمی سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ وہ نقشہ اب مُجھے دے دیجیّے۔"

"نقشہ تو تمھیں نہیں مل سکتا۔" میں نے کُبڑے کی بے بسی کو دیکھ کر کہنا شروع کیا:

”تمھیں شاید یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ ہم دونوں دو مرتبہ اس خیمے سے نکل کر اندر جنگل میں گئے تھے۔“

”یہ مُجھے افسوس ہے کہ بعد میں معلوم ہوا، میں نے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر آپ نہیں ملے، ویسے مُجھے یقین ہے کہ آپ دونوں حضرات نقشے کو کہیں دبا آئے ہوں گے۔“چیتن نے کہا۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے اچانک اپنا پستول نکال کر اس کا رخ کُبڑے کی طرف کرکے کہنا شروع کیا:

”خزانے کا نقشہ اب بھی ہمارے پاس ہے، ہم نے یہ سوچا کہ جب تک یہ نقشہ ہمارے پاس رہے گا تم اسے حاصل کرنے کے لئے ہمیں پریشان کرتے رہو گے، اس لئے ہم نے نقشہ زبانی یاد کرلیا ہے۔“

"زبانی یاد کرلیا ہے!" کُبڑے نے حیرت سے کہا: "زبانی یاد کرنے سے کیا مطلب۔۔۔! مگر تم نے یہ پستول مُجھ پر کیوں تان لیا، جب کہ میں بالکل نہتا ہوں؟"

میں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر پھر کہا۔

"نقشے کی ایک ایک بات اور ذرا ذرا سی تفصیل ہم دونوں نے اپنے ذہن میں محفوظ کرلی ہے، اور اصل نقشہ اب یہیں تمہارے سامنے تلف کر دیتے ہیں۔"

"یعنی۔۔۔۔ یعنی۔۔۔" کُبڑے سے حیرت کے مارے کُچھ کہا نہیں گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مُجھے دیکھ رہا تھا۔

"یعنی اُسے ابھی دیا سلائی دکھا دیتے ہیں اور ساتھ ہی اس بات کا حلف اٹھا

کر یہ کہتے ہیں کہ نقشے کی نقل کسی دوسرے کاغذ پر ہم نے بالکل نہیں کی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے "کُبڑے نے کہا: ”مگر یہ پستول تو ہٹاؤ۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، نقشہ تمہارے سامنے جلایا جائے گا، پستول تم پہ یوں تانا گیا ہے کہ کہیں تم جلتے ہوئے نقشے کو حاصل کرنے کے لیے جھپٹ نہ پڑو، کیا سمجھے؟ ہاں جان صاحب، اب آپ نقشے کو دیا سلائی دکھا دیجیے۔“

جان اب تک خاموش کھڑا حیرت سے میری سب باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بھی غالباً میری اس رائے سے اتّفاق کیا ہوگا، اس لیے اس نے نقشہ فوراً جیب سے نکال لیا، اور ماچس بھی اپنے ہاتھ میں لے لی۔

”حضور جادُوگر صاحب، اس نقشے کو آپ بھی خوب غور سے دیکھ لیجیے۔ کہیں آپ کو حسرت نہ رہ جائے کہ آپ نے نقشہ دیکھا ہی نہیں۔ جان

صاحب، نقشہ انہیں دور سے اچھّی طرح دکھا دیجئے۔“

جان نے میرے کہنے پر عمل کیا، نقشہ دیکھتے ہی کُبڑے نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر پستول کا رُخ اپنی طرف دیکھ کر پھر رک گیا، جان نے اس عرصے میں نقشے کو آگ لگا دی تھی اور نقشہ اب آہستہ آہستہ جل رہا تھا۔ اس وقت کُبڑے کی شکل دیکھنے کے لائق تھی، اس کا چہرہ بالکل زرد تھا، غصّے کے مارے وہ بری طرح کپکپا رہا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ مُجھے کچا چبا جائے۔

نقشہ جب اچھّی طرح جل چکا تو میں نے کُبڑے سے کہا:

”اب اگر آپ چاہیں تو اس راکھ پر جادُو کر کے اسے دوبارہ نقشے میں تبدیل کر لیجئے۔“

"تم۔۔۔۔!" وہ پیر زمین پر پٹخ کر بولا: "تم میرا مذاق اُڑاتے ہو، تمھیں اپنی جان کی ذرا بھی پروا نہیں، میں کہتا ہوں پچھتاؤ گے۔۔۔ بہت پچھتاؤ گے۔۔۔"

"چھوڑیے، اس پچھتانے کو، اگر ہماری قسمت میں پچھتانا ہی لکھا ہے تو پچھتا لیں گے، مگراب آپ یہاں سے تشریف لے جائیے کیوں کہ مُجھے سخت نیند آرہی ہے، اوراب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں چلا جاؤں؟ ہاہاہا۔۔۔" کُبڑا ہنسی کے مارے پھر دوہرا ہوگیا۔

"ضرور چلا جاؤں گا ننھّے چوہے۔۔۔ تمھاری قسمت کا حال بتا کر جاؤں گا۔ یہ بتا کر جاؤں گا کہ آگے تمھاری تقدیر میں کیا ہونا لکھا ہے، جو کُچھ میں کہوں اسے کان کھول کر سن لو۔ اور جب میں چلا جاؤں تو تنہائی میں میری ان کہی باتوں پر خوب غور کرنا، نہیں نہیں میری بات کاٹنے کی کوشش نہ کرو،

اور اب سنو کہ آئندہ تمہارے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے؟ یہاں سے
آگے بڑھنے پر کل تمہیں ایک میل کے اندر جنگل میں دو بڑے بڑے پتھرّ
کے بُت نظر آئیں گے، تم اپنے آپ کو ان سے خواہ کتنا ہی بچاؤ، مگر وہ
تم پر ضرور گریں گے۔ اچانک طوفان آئے گا، درخت ٹوٹ ٹوٹ کر زمین
پر گریں گے اور بڑی تیز ہوا چلے گی، ایسے وقت وہ بُت تم پر گِر جائیں
گے، مگر تم ان سے میرے جادُو کی وجہ سے بچ جاؤ گے، اس کے بعد
تیسرے دِن تم ایک پہاڑی راستے سے گزر رہے ہوں گے کہ اچانک
زلزلہ آئے گا اور زمیں پھٹ جائے گی، تم اس زمین میں دھسنے لگو گے مگر
میرا جادُو تم کو بچا لے گا۔ میرے تم پر یہ دو احسان ہوں گے اور میں ان
احسانوں کے بدلے میں یہ چاہوں گا کہ تم خزانے کا وہ نقشہ جو اب
تمہارے ذہنوں میں محفوظ ہے دوبارہ کاغذ پر اتار دو، میں تمہیں دو دِن کا یہ

وقت اس لیے دے رہا ہوں کہ تم میری طاقت سے واقف ہو جاؤ، میری عزّت کرو اور میرا کہا مان لو۔ بس مُجھے اس کے علاوہ اور کُچھ نہیں کہنا، اب میں جاتا ہوں، تم سے پرسوں ملاقات ہوگی، اور وہ ملاقات ایسی ہوگی کہ میرا رُعب تُم پر طاری ہو چکا ہو گا اور تم میری بات ماننے کے لئے بے قرار ہوں گے۔"

اتنا کہہ کر وہ جلدی سے مڑا اور بغیر پیچھے دیکھے فوراً خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر چلا گیا، میں نے اب جان کو دیکھا وہ کُچھ سوچ رہا تھا، کہ جو کُچھ کُبڑے نے کہا ہے اس پر یقین کیا جائے یا نہیں؟

"آپ کُچھ سوچیے نہیں۔" میں نے جان سے کہا:

"میں اچھّی طرح جانتا ہوں کہ وہ محض ہمیں خوفزدہ کر کے ہم سے وہ نقشہ دوبارہ بنوانا چاہتا ہے۔ مگر میں اس کی چالوں سے اچھّی طرح واقف ہو چکا

ہوں اور خوب سمجھتا ہوں کہ اس کو اُکسانے والا کون ہے، وہ کس کے کہنے پر یوں ہمیں بار بار آ کر ڈراتا ہے۔"

"کس کے کہنے پر ڈراتا ہے؟" جان نے حیرت سے دریافت کیا۔

میں نے پہلے خیمے کا پردہ اٹھا کر یہ اطمینان کر لیا کہ کُبڑا آس پاس کہیں ہے تو نہیں پھر میں نے جان کے قریب جا کر آہستہ سے اسے وہ وقت یاد دلایا جب کہ وہ نقشہ میری کمر پر بنانے کے بعد واپس خیمے میں آیا تھا اور میں نے جیک کے خیمے میں ایک شخص کو دیکھ کر بہت تعجّب کیا تھا۔ بلکہ سب سے زیادہ تعجّب اس بات کا ہوا تھا کہ جو شخص بہت کم بولا کرتا تھا اور جسے ہم اب تک گونگا سمجھتے رہے تھے، وہ چپکے چپکے دوسروں سے باتیں کرنے کا عادی ہے۔ آپ شاید نہیں سمجھے۔

خیمے میں گونگا جیک کُبڑے جادُوگر سے باتیں کر رہا تھا۔

اگر کوئی بم پھٹ جاتا تو جان کو اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی یہ سن کر ہوئی کہ
جیک، جسے وہ سمجھتا تھا کہ اس کا دایاں بازو اور بُرے وقت میں کام آنے
والا بہادر ساتھی ہے، اپنی مطلب برداری یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے
کُبڑے چیتن سے ساز باز رکھتا ہے۔ آخر اس میں اس کی کیا مصلحت تھی؟
سچ پوچھیے تو مصلحت بھی اس کے سوا اور کیا ہو گی کہ اس طرح وہ کُبڑے
جادوگر کو ہماری خبریں پہنچاتا رہے، بلکہ میں تو کہوں گا کہ جیک اور کُبڑا
دراصل ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے تھے۔ جیک جس انداز سے اس سے
رات کو خیمے میں باتیں کر رہا تھا، اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا اثر
کُبڑے پر بہت زیادہ ہے، میرے مالک جان کا خیال تھا کہ جیک ہمارا ایسا
دُشمن تھا جو ہر وقت ہمارے ساتھ رہ کر ہمارے دِلوں کا بھید معلوم کرنا
چاہتا تھا، اور موقع ملنے پر ہمیں قتل بھی کر سکتا تھا۔ ایسے دغا باز انسان سے

اب ہوشیار رہنے کا وقت آگیا تھا۔

رات اب بہت زیادہ ہوگئی تھی، ہوامیں ہلکی ہلکی نمی بھی پیدا ہونے لگی تھی، مچھر اتنے تھے کہ ہمیں کسی صورت سے بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ نیند کا نہ آنا ہی ہمارے لئے بہتر تھا کیوں کہ دُشمن اب ہماری تاک میں تھے اور کسی وقت بھی ہم پر وار کرسکتے تھے۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے، تو ایسا ہی کُچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ بستروں پر لیٹتے ہی ہم ایسے سوئے کہ پھر صُبح سورج کی پہلی کرن نے ہی ہمیں جگایا۔ میں نے اس سفر میں ایک خاص بات کو اپنی عادت بنا لیا تھا اور وہ بات یہ تھی کہ سونے کے بعد جب میں جاگتا تو بغیر ہلے جلے آنکھیں پہلے ہلکی سی کھولتا تاکہ اگر کوئی خطرہ آس پاس ہو تو اسے محسوس کرلوں۔

میری یہ عادت اس وقت بہت کام دے گئی، جیسے ہی میں نے آنکھیں

ہلکی سی کھولیں تو مُجھے پلکوں کی چلمن سے دروازے میں ایک دبلا پتلا سایہ کھڑا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں۔ اب میں صرف آہٹ سن رہا تھا۔ قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگی۔ پھر کوئی میرے پہلو میں آکر بیٹھ گیا، شاید اس نے جھُک کر میری شکل کو دیکھا کیوں کہ اس کا گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہا تھا، اور پھر یکایک مُجھے ایک آواز سُنائی دی۔

"فیروز! بنو مت، میں جانتا ہوں تم جاگ رہے ہو، خُدا کے لئے اٹھو اور میری بات سنو۔"

میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیوں کہ یہ عبدل کی آواز تھی، اور جہاں تک مُجھے یقین تھا عبدل ایسا آدمی نہیں تھا جس سے مُجھے یا جان کو ڈر لگتا۔ لیکن خطرے کے وقت غیروں سے تو کیا ا

پنوں سے بھی خدشہ ہوتا ہے، کہ کوئی غَلَط قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔ اس لئے میں مجبور تھا کہ عبدل کو بھی شک کی نظروں سے دیکھوں۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے اپنے پستول پر ہاتھ رکھ کر کہا :

"کیا بات ہے، آپ اس طرح چوری چھپے ہمارے خیمے میں کیوں آئے ہیں؟"

"فیروز! میری بات سنو" عبدل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا :

"مُجھے یقین ہے کہ تم بہت بہادر اور نڈر لڑکے ہو، مگر میں ایک خطرے سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔"

"خطرہ۔۔۔کیا خطرہ؟" میرے ساتھ ہی جان بھی یکایک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"مسٹر جان، تم آرام سے پڑے سوتے ہو لیکن تمہیں کُچھ بھی معلوم نہیں

کہ یہاں کیا کُچھ ہونے والا ہے؟ ہم تینوں اس وقت سخت خطرے میں گھرے ہوئے ہیں، فیروز جاگ رہا تھا۔ اس لیے میں نے اُسے ہی بتانا مناسب سمجھا۔ میں تم سے ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے۔۔۔"

اتنا کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر خیمے کے پردوں سے کان لگا کر باہر کے ماحول کا اندازہ لگایا، جب کوئی آہٹ سُنائی نہ دی تو اس نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی اور پھر ہمارے پاس آکر کہنے لگا۔

"اور وہ راز یہ ہے کہ ہمیں جیک بے ہوشیار رہنا ہو گا، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ خاموش رہنے والا آدمی بہت معصوم ہے، نہیں بلکہ وہ کُبڑے جادوگر کا آقا ہے۔ اُس نے کُبڑے کو ہمارے پیچھے خزانے کا وہ نقشہ حاصل کرنے کے لیے لگا رکھا ہے۔"

اس سے پہلے کہ جان کُچھ بولتا میں نے چہرے پر مصنوعی مُسکراہٹ پیدا کر کے کہا۔

"ارے! یہ۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں، حقیقت یہی ہے، میں نے ابھی ان دونوں کو آپس میں باتیں کرتے سُنا ہے۔" عبدل نے دانت پیس کر جواب دیا۔

میں نے پھر حیرت ظاہر کی، میں چاہتا یہ تھا کہ اگر عبدل بھی دُشمنوں کے ساتھ ہے تو ہمیں خود اسے یہ نہیں بتانا چاہیئے کہ ہم ان کے راز سے واقف ہو گئے ہیں۔ اس طرح وہ ہمارے اور دُشمن ہو جائیں گے، مگر مُجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ عبدل ایسا نہیں ہے، کیوں کہ اس کی آنکھوں میں سچ کی چمک تھی، اور اس کے لہجے کی گھبراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہمارا وفادار ہے۔ یہ اندازہ لگانے کے بعد میں نے جان سے کہا:

”جان صاحب، عبدل ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپ انہیں بتا دیجئے کہ ہمیں یہ بات پہلے ہی سے معلوم ہے اور اب ہم جلدی یہاں سے کوچ کر دیتے ہیں۔“

جان نے پھر مختصراً تمام باتیں عبدل کو بتائیں مگر میں اس موقع پر اس کی تعریف کیے نہیں رہ سکتا کہ احتیاطاً اس نے نقشے کا میری کمر پر نقل ہو جانے والا راز اب بھی عبدل سے چھپایا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس نے پہلی بار یہ کام عقل مندی کا کیا تھا۔ عبدل لاکھ اپنا ہی آدمی سہی مگر اپنوں کو غیر بنتے کیا دیر لگتی ہے؟ جیک کی مثال ہمارے سامنے تھی!

عبدل نے جب سب باتیں سُن لیں تو اس نے بھی یہی رائے دی کہ اب جلد سے جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیئے۔ میں نے غور سے عبدل کا چہرہ دیکھا، تو اندازہ ہوا کہ اس وقت وہ سخت غصّے میں ہے، بار بار اپنے چمڑے

کے تھیلے میں سے اپنا وہی خاص قسم کا کمان جیسا ہتھیار نکال کر اس کی دھار پر انگلی پھیر کر دیکھتا تھا۔ جان اس کے ارادے کو بھانپ کر بولا۔

"خبردار عبدل، خواہ مخواہ کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہ کرنا۔ ہم یہاں خون بہانے نہیں آئے، بلکہ خزانے کو اور اس مکھّی کو تلاش کرنے آئے ہیں جس کے سامنے ساری دنیا کے خزانے ہیچ ہیں۔ سمجھے۔"

"میں سمجھ تو گیا مسٹر جان! مگر۔" عبدل نے وہ ہتھیار اپنے تھیلے میں رکھنے کے بعد کہا:

"مگر میں جیک کو اُس کی اس غدّاری کی سزا ضرور دوں گا۔"

"نہیں ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے۔" جان نے کہا۔

"خیر آپ کہتے ہیں تو میں اپنے غصّے پر قابو پانے کی پوری کوشش کروں

گا۔ خُدا کرے کہ میں اپنے ارادے میں کامیاب رہوں۔“

اتنا کہنے کے بعد وہ ہمارے خیمے سے باہر نکل گیا۔

سورج نے جو اجالا پورے جنگل میں پھیلایا تھا، اس نے ہمارے دِلوں کو ڈھارس دی۔ کیوں کہ یہی جنگل رات کو بہت بھیانک نظر آ رہا تھا، اور اب دِن میں اس کی ہیبت ایک حد تک کم ہو گئی تھی، جو لمبے لمبے درخت رات کو دیوؤں کی طرح نظر آتے تھے، اب صُبح کے اجالے میں اتنے بھیانک دکھائی نہ دیتے تھے۔۔۔ ہم مل جل کر اپنا سامان باندھ چکے تھے اور اب یہ سامان خچروں پر لادنا باقی تھا، جیک ہم سب سے الگ تھلگ ایک بڑے پتھرّ پر بیٹھا ہوا اپنا پستول صاف کر رہا تھا۔ میرے ان تینوں مالکوں کے رویّے میں اب عجیب و غریب تبدیلی آ چکی تھی، جان اور عبدل تواب مُجھے نوکر کے بجائے اپنا ساتھی سمجھتے تھے، ہاں البتّہ جیک کی

آنکھوں میں میں نے ہمیشہ بے رحمی جھلکتی دیکھی تھی۔ جب بھی وہ مُجھے دیکھتا بڑی خطرناک اور غصّیلی نظروں سے دیکھتا۔ پہلے تو میں ان نظروں سے مرعوب ہو جایا کرتا تھا مگر اب میں بھی ان نگاہوں میں نگاہ ڈال کر دیکھا کرتا۔ اور تب جیک مُجھے بڑی حیرت سے باربار دیکھتا۔

اب ہم سب تیّار ہو چکے تھے، سامان کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ہم نے اپنا سفر پھر شروع کیا۔ جنگل پھر بہت گھنا ہونے لگا تھا اور قدم قدم پر مشکلات سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ خچروں کے لئے راستہ بنانے کی خاطر ہمیں تیز دھار والے خنجروں سے راستے کے جھاڑ و جھنکار اور بل کھاتی ہوئی بیلیں صاف کرنی پڑتی تھیں۔ یہ بات لکھنے کو تو میں نے صرف دو لفظوں میں لکھ دی ہے، لیکن اس کام کو کرنے کے لیے ہمیں جتنی محنت کرنا پڑی، وہ بس ہمارا ہی دِل جانتا ہے۔ ہمارے جسم لہولہان ہو گئے تھے،

کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور ٹانگوں سے خون بہہ بہہ کر ہمارے
جوتوں میں جم گیا تھا۔ اس سفر میں تھکے ہوئے جسم کو آرام دینے کی خاطر
میرے علاوہ باقی سبھی لوگ جنگل کے درمیان ملنے والے چھوٹے چھوٹے
تالابوں میں کئی بار نہائے تھے، جی چاہتے ہوئے بھی میں جان بوجھ کر
نہیں نہایا تھا، میری کمر پر جو نقشہ بنا ہوا تھا اس کے کھل جانے کا تو ڈر تھا
نہیں مُجھے، ہاں البتّہ قمیص اتارنے سے میری کمر ننگی ہو جاتی اور نقشہ سب
کی نظروں میں آجاتا۔ میں یہ کسی صورت سے نہیں چاہتا تھا، خیر یہ تو اس
وقت کی بات تھی جب کہ سب لوگوں نے نہانے کی خواہش ظاہر کی تھی،
مگراب جب کہ میری قمیض بھی تار تار ہونے لگی تھی۔ زخموں سے میں
چور چور تھا اور مُجھے اپنی بھی خبر نہ تھی، فرض کر لیجئے اگر ایسے موقع پر قمیص
میں سے وہ نقشہ دُشمنوں کو نظر آجاتا تو۔۔۔۔!

جگہ جگہ درختوں سے کمر لگا کر میں بظاہر سستانے کے لیے کھڑا ہو جاتا لیکن دراصل ایسا کر کے میں دوسروں سے اپنی کمر کو چھپاتا تھا۔ اس کے علاوہ کوشش کرتا کہ سب سے پیچھے چلوں۔ مگر ایسا کرنے کے باوجود بھی دِل مطمئن نہ تھا۔ کون جانے کب راز کھل جائے، آخر اچانک مُجھے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔

میں نے اپ نے چہرے پر یکایک ایسا اثر پیدا کر لیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میں بہت تکلیف میں ہوں، آنکھیں اس انداز سے کھول لیں جیسے میں بے ہوش ہونے والا ہوں، ہلکی ہلکی سی ہائے ہائے کی آواز بھی نکالنی شروع کر دی، اس ہائے ہائے نے سب کو میری طرف متوجّہ کر لیا۔ جان دوڑ کر میرے پاس آیا اور گھبرا کر پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے فیروز، کیا ہوا، تم کراہ کیوں رہے ہو؟"

"مُجھے۔۔۔ مُجھے بخار سا محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا: "جلدی سے کوئی کمبل اوڑھا دیجئے۔"

یہ سن کر جان فوراً خچروں کی طرف دوڑا، عبدل اور جیک بھی سامان میں سے کمبل تلاش کرنے لگے۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے میں دِل ہی دِل میں ہنس رہا تھا۔ جیک میرا دُشمن بھی اس وقت مُجھے بچانے کی فکر میں تھا، میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ اسے میری جان اتنی عزیز نہیں ہے، جتنا کہ نقشہ، نقشہ چونکہ اس کے خیال میں میرے ذہن میں محفوظ تھا، اس لیے وہ مُجھے بچانے کی کوشش کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

سامان میں سے سب سے پہلے کمبل جان ہی نے نکالا اور پھر دوڑ کر میری طرف آیا، جلدی سے اس نے مُجھے کمبل اوڑھا دیا اور مُجھے سہارا دے کر آگے آگے چلنے لگا۔ باقی لوگ ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگے راستے میں

جان نے بہت ہلکی سی آواز میں مجُھ سے کہنا شروع کیا۔

"شاباش فیروز۔۔۔ اتنی سی عمر میں تم ایسی عقل مندی کی باتیں کر کے مجُھے حیرت میں ڈال دیتے ہو، سچ بات تو یہ کہ راستے بھر میں بھی یہی سوچتا ہوا آیا تھا کہ اب جب کہ تمہاری قمیص پھٹ چکی ہے، خزانے کے نقشے کی حفاظت کا انتظام کیا ہونا چاہیئے؟ میں تمہاری اس ہوشیاری کی داد نہیں دے سکتا جو تم نے ابھی کی ہے۔۔۔ شاباش۔"

میں نے مُسکرا کر جواب دیا:

"اور مجُھے خود بھی آپ کے اس طرح سے یہ بات جان لینے کی تعریف کرنا پڑتی ہے، آپ نے بھی خوب پہچانا کہ میری اس اداکاری کا مطلب کیا ہے؟"

"خیر یہ تو ہوا۔" جان نے کہا : "اب کوشش یہ کرو کہ جب تک تمہارے لیے کپڑے مہیّا نہ ہو جائیں، تم اسی طرح اداکاری کرتے رہو، جہاں تک مُجھے یاد پڑتا ہے، وہ خزانہ اسی جنگل میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ نقشے میں صرف جنگل ظاہر کیا گیا ہے۔ خزانے کی اصل جگہ نہیں دکھائی گئی، وہ جگہ ہمیں خود تلاش کرنی پڑے گی۔ لیکن ان دُشمنوں کی موجودگی میں یہ کام بہت مشکل نظر آتا ہے۔ ہم جس جگہ بھی جائیں گے یہ لوگ ہمارے پیچھے پیچھے ضرور آئیں گے۔"

بات واقعی معقول تھی۔ لیکن اب اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔۔۔ ہمیں دُشمنوں کی موجودگی ہی میں سب کام پورا کرنا پڑا تھا۔ جنگل کا راستہ، اگر ہم اسے راستہ کہیں تو بہت ہی دشوار ہونے لگا تھا، ہم لوگ اب شاخوں پر چڑھ کر اور دوسری طرف کود کود کر راستہ طے کر رہے تھے۔ خچرّ چوں کہ

ایسے گھنے درختوں کو پھلانگ نہیں سکتے تھے، اس لیے ان کے لیے ہمیں راستہ ضرور صاف کرنا پڑتا تھا۔ جیک ہم سب میں سب سے زیادہ طاقتور تھا، اس لیے وہی درختوں کو کاٹ کاٹ کر پھینکتا تھا۔ دشوار گزار اور گھنے جنگل کے درختوں اور کانٹے دار پودوں سے رگڑ کھانے کے بعد خچروں کے جسموں پر بھی جگہ جگہ خراشیں آ گئی تھیں۔ ہمیں ان کی بھی فکر تھی، کیونکہ اس خطرناک سفر میں خچّر ہی ہمارے لیے سب سے بڑا سرمایہ تھے، راستے کی دشواریوں کا اندازہ میری یہ داستان پڑھنے والے اس بات سے کر سکتے ہیں کہ آدھے میل کا یہ فاصلہ ہم لوگوں نے پورے ایک دِن میں طے کیا۔ صُبح ہم نے سفر شروع کیا تھا اور اب شام ہونے والی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر جان نے عبدل سے کہا۔

"میرے خیال میں ہمیں جلد از جلد اس جنگل کو پار کر لینا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ

رات ہو جائے اور ہم یہیں پھنسے کے پھنسے رہ جائیں۔"

"مگر جس رفتار سے ہم چل رہے ہیں، اس طرح تو ہم یہ جنگل دو دِن میں بھی پار نہیں کر سکتے۔" عبدل نے جواب دیا۔

جان کُچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا اور پھر بولا۔

"عبدل! میرے خیال میں بہتر ہو گا اگر تم جیک سے بھی دریافت کر لو۔ وہ گونگا تو خیر بنا ہوا ہے مگر گردن ہِلا کر جواب تو دے سکتا ہے۔"

عبدل بھی اِس رائے کو مانتے ہوئے جیک کی طرف مُڑا، مگر یہ دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ جیک وہاں نہیں تھا۔ ہم نے درختوں کے تنوں کی اوٹ سے جھانک کر دور دور تک اسے دیکھا مگر اب صرف اس کا خچّر کھڑا ہوا زمین پر اپنے پیر مار رہا تھا اور جیک اس پر سوار نہ تھا۔

فوراً ہی ہمیں خطرے کا احساس ہوا۔

جبکہ ہماری نظروں میں پہلے ہی کُچھ اچھّا نہ تھا، اب اس کے اس طرح کہیں چھپ جانے سے وہ پہلے سے بھی زیادہ بُرا نظر آنے لگا۔ عبدل نے سرگوشی کرتے ہوئے جان سے کہا۔

"میرے خیال میں وہ ضرور اُس کُبڑے جادوگر کے پاس گیا ہے، آخر اُس کُبڑے کی کہی ہوئی باتیں پوری بھی تو ہوں گی، پتھرّ کے بتوں کا ہم پر گرنا، بڑے بڑے درختوں کا ہمیں کُچل دینا، اور زلزلے کا آنا، آخر یہ سب کب ہوگا؟"

"ابھی اور اِسی وقت۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔" جان نے حیرت سے کہا۔

”وہ دیکھیے، اس بڑے درخت کی آڑ سے وہ دونوں پتھرّ کے لمبے بُت نظر آ رہے ہیں۔“

جان نے غور سے دیکھا تو واقعی اسے بہت حیرت ہوئی کیونکہ وہ بُت ہم سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر ہوں گے، بڑی ڈراؤنی شکلوں والے یہ قدِ آدم بُت اتنے لمبے تھے کہ اگر وہ گرتے تو ہم پر ضرور آتے، ہم چونکہ ایک قسم کے پنجرے میں بند تھے، (درختوں کے اِس جھنڈ کو میں پنجرہ ہی کہہ سکتا ہوں۔) اِس لیے فوراً بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ کُبڑے کی پیش گوئی بالکل صحیح ثابت ہونے والی تھی۔

یکایک چند ہی لمحوں کے اندر درختوں کی سائیں سائیں تیز ہو گئی، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جنگل بہت گھنا تھا، اس لئے آسمان تو نظر نہ آتا تھا، البتّہ درختوں کے بری طرح ہلنے سے اور پتوں کے لگاتار بڑھتے ہوئے شور

سے ہم یہ سمجھ گئے کہ طوفان آ گیا ہے۔ بڑی سخت ہوا چلنے لگی۔ یہ ہوا
آہستہ آہستہ بڑھتی ہی جا رہی تھی، جو درخت کمزور تھے وہ دوہرے ہو کر
زمین سے لگنے لگے، بعض دفعہ تو ایسا محسوس ہوتا کہ درخت ہم پر اب گرا
اور اب گرا۔ جان نے مُجھے اچھّی طرح کمبل اوڑھا دیا، اسے ڈر تھا کہ کہیں
کمبل ہی ہوا میں نہ اڑ جائے۔ درختوں کے پتّوں پر اب نئے قسم کا شور پیدا
ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ بارش بھی شروع ہو گئی ہے، میرے خیال کی
تصدیق کڑک اور چمک نے فوراً ہی کر دی۔ جان نے عبدل کو آواز دی کہ
وہ خچروں کو درختوں سے باندھ دے۔ مگر اچانک یہ معلوم کر کے بڑی نا
اُمّیدی ہوئی کہ عبدل بھی غائب ہے۔ جان کو بڑی حیرت ہوئی، مجبوراً اس
غریب نے خود ہی خچروں کو باندھا اور جب وہ واپس آ رہا تھا تو اچانک
درختوں کے درمیان سے کوئی چیز زمین پر کودی۔

یہ عبدل تھا، جان کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ جیک کو تلاش کرنے گیا تھا۔ مگر جیک اسے کہیں نہ ملا، ہوا اب اتنی تیز ہو گئی تھی کہ عبدل کی باتیں بھی مشکل سے ہی سُنائی دیتی تھیں۔ آخر ہم تینوں ایک جگہ ایک دوسرے کو پکڑ کر بیٹھ گئے، کیوں کہ اگر نہ بیٹھتے تو ہوا ہمیں ضرور الگ الگ کر دیتی۔

طوفان بڑھتا ہی جا رہا تھا، خوفناک کڑک اور بجلی کی چمک نے ماحول کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔ درختوں نے ایسا شور مچا رکھا تھا کہ بس توبہ ہی بھلی۔ اچانک مُجھے بڑی ہیبت ناک آواز سُنائی دی ایسی آواز جیسے کوئی چیز ٹوٹی ہو، نظر اٹھا کر دیکھا تو پتھرّ کے بنے ہوئے وہ لمبے لمبے بُت جڑ سے اُکھڑ کر ہماری طرف ہی گر رہے تھے، اگر وہ ہم پر گرتے تو یقیناً ہمیں پیس کر سُرمہ بنا دیتے، خوف کے مارے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور انتظار کرنے لگا کہ بُت کب نیچے گرتے ہیں۔

خوف کے مارے میری آنکھیں بند تھیں اور دِل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ مُجھے یقین تھا کہ بُت مُجھ پر گرنے ہی والے ہیں، مگر ایسا نہ ہوا۔ پتھرّ کے ان لمبے بُتوں کے گِرنے سے ذراسی بھی آواز پیدا نہ ہوئی۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں، آپ میری حیرت کا اندازہ کرسکتے ہیں، جب میں نے دیکھا کہ بُت ایک لمبے اور مضبوط درخت کے سہارے ہمارے سروں کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ اگر وہ درخت نہ ہوتا تو ہم لوگوں کا پس جانا یقینی تھا۔

اچانک ہوا کا وہ طوفان، وہ کڑک اور چمک سب ختم ہو گئ، بس کبھی کبھی بھیگے ہوئے پتّوں سے پانی کے قطروں کے نیچے ٹپکنے کی آواز آرہی تھی ورنہ ہر طرف سنّاٹا تھا، ہمارے دِل ابھی تک قابو میں نہ آئے تھے۔ سب درخت کے نیچے دُبکے ہوئے بیٹھے تھے، ہوش اس وقت آیا جب

خچروں کے ہنہنانے کی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑیں۔ جان نے چیخ کر کہا:

"ارے، بے چارے خچروں پر ایک درخت آ گرا۔"

یہ سُنتے ہی ہم تینوں اُٹھ کر تیزی سے خچروں کی طرف بھاگے، کیوں کہ میں یہ پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ اس خطرناک سفر میں یہ خچر ہمارا سب سے بڑا سرمایہ تھے، جا کر دیکھا تو خچروں کو اتنا زیادہ نقصان نہ پہنچا تھا۔ دوسرے جو درخت ٹوٹ کر ان پر گِرا تھا وہ کُچھ اتنا زیادہ وزنی بھی نہیں تھا۔

جان نے خچروں کو تھپکتے ہوئے کہا:

"ہمیں اپنا سفر پھر شروع کر دینا چاہیئے، ہمیں خزانہ تلاش کرنا ہے۔ خزانہ گو اسی جنگل میں کہیں چھپا ہوا ہے، مگر ہمیں اس کا صحیح مقام نہیں معلوم۔

صرف کوئی غیبی طاقت ہی ہماری مدد کر سکتی ہے، ورنہ اگر ہم برسوں تک بھی یہاں سر کھپائیں تو اسے نہیں پا سکتے، چلو جلدی کرو۔ اب اس کام میں دیر اچھّی نہیں۔"

یہاں میں پڑھنے والوں کی ایک غَلَط فہمی دور کر دوں، جان بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اسے خزانے کی اصل جگہ کا پتہ نہیں ہے، مگر در حقیقت ایسا نہیں تھا۔ وہ نقشہ جو میری کمر پر بنا ہوا تھا اس میں وہ جگہ صاف طور پر دِکھائی گئی تھی، جہاں خزانہ دفن تھا۔ ایک بہت ہی گھنے اور دشوار گزار جنگل کے بعد پرانے زمانے کے کُچھ زمین دوز کھنڈرات میں ایک خاص مقام پر وہ خزانہ دفن تھا۔ ہم کو یقین تھا کہ ایک یا دو دِن کے اندر اندر ہم ان کھنڈرات تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ مگر یہ جان کی عقل مندی تھی کہ وہ جان بوجھ کر سب کے سامنے جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دُشمن ہمارے پیچھے

پیچھے آ رہے ہیں۔ اس لئے اس کی زبان سے کوئی غَلط بات نہیں نکلنی چاہیئے۔ جان کی زبان سے ابھی یہ فقرے ادا ہوئے ہی تھے کہ اچانک ایک بہت بڑی چٹّان کی اوٹ میں سے وہ چیز نمودار ہوئی جسے دیکھتے ہی نفرت کا ایک دریا میرے سینے میں لہریں مارنے لگتا تھا، اور جو اس وقت میرا سب سے بڑا دُشمن تھا، یعنی کُبڑا چیتن۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں مسٹر جان۔" اس منحوس نے اپنی اسی زہریلی مُسکراہٹ کے ساتھ کہنا شروع کیا:

"واقعی اس طرح خزانہ آپ کو کبھی نہیں مل سکتا۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اسے پھر ایک کاغذ پر نقل کر دیں تاکہ ہم سب ایک ساتھ اس میں دماغ لڑائیں۔"

"ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا۔" میں نے چلّا کر کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"ارے ننّھے چوہے، یہ تم بولے تھے، کیا بات ہے بخار میں پھنکنے کے باوجود بھی تمہاری آواز اتنی کراری نکل رہی ہے؟ خیر کوئی بات نہیں تم لوگ اگر نقشہ نہیں دینا چاہتے تو نہ سہی، تمہاری مرضی۔ مُجھے پہلے ہی معلوم ہوچکا تھا کہ تمہاری یہ خواہش نہیں ہے۔"

"کس سے معلوم ہوا تھا؟ کیا جیک سے؟" جان نے پوچھا۔

"چلیئے اب میں مان لیتا ہوں کہ جیک میرا آقا ہے، اور میں اس کے لیئے کام کررہا ہوں۔ کیا فائدہ یہ بات چھپانے سے، جب کہ آپ کا ننّھا چوہا پہلے ہی سب کُچھ جان چکا ہے۔ جیک سے مُجھے سب باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ مگر اب آپ کہیئے کہ کیا آپ میرے جادُو کے قائل ہوئے یا نہیں؟ بُت آپ پر گرنے والے تھے مگر آپ بچ گئے، اب زلزلہ بھی آئے گا، میں نے آپ سے پہلے کہا تھا کہ تین دِن بعد ایسا ہوگا، مگر اب یہ دوسری پیش

گوئی کرتا ہوں کہ وہ زلزلہ ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر آئے گا، مگر اس زلزلے سے آپ لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب میں چلتا ہوں، اور ساتھ ہی یہ بات بھی آپ لوگوں کو بتا دیتا ہوں کہ جیک اب آپ کے پاس نہیں آئے گا، ہم دونوں اب اسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے جب کہ آپ خزانہ پا چکے ہوں گے۔"

اتنا کہہ کر وہ طنزیہ انداز میں تھوڑا سا جھُکا اس کی کمر کا کب دیکھ کر مجُھے متلی ہونے لگی، اپنی تیز اور چیل جیسی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے کے بعد وہ پھر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ کُبڑا دراصل جو بات بھی کہہ رہا تھا میرے خیال میں بالکل ٹھیک تھی، دیکھا جائے تو اس کی پیش گوئیاں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی تھیں، میرا دل چاہتا تھا کہ اسے فوراً قتل کر دوں، مگر قتل کا نام لینا تو آسان ہے اور یہ کام کرنا بہت مشکل، مجُھ جیسے کمزور لڑکے سے یہ

کام کسی طرح بھی نہ ہو سکتا تھا، دوسرے میں اور جان دونوں خون خرابے سے بہت دور بھاگتے تھے، خواہ مخواہ کسی کی جان لینا کوئی بہادری نہیں ہے اگر ہمیں کسی سے کوئی تکلیف پہنچتی بھی ہے تو اس سے بدلہ لینا خُدا کا کام ہے، ہمارا نہیں۔

* * * * * *

کُبڑے کے جانے کے بعد جان نے عبدل سے کہا کہ وہ خچّروں کو ہانکے، مُجھ سے کہا گیا کہ میں کسی بھی خچّر پر بیٹھ جاؤں، کیوں کہ میری طبیعت "ٹھیک" نہیں ہے، جان کا کہنا مان کر میں فوراً خچّر پر جا بیٹھا اور کمبل کو اچھّی طرح اپنے جسم سے لپیٹ لیا۔

اب ہمارا سفر پھر شروع ہوا، جنگل میں درخت آپس میں اس طرح مل گئے تھے جیسے طوطے کے پنجرے کے تار آپس میں ملے ہوتے ہیں۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی مُصیبتوں اور تکلیفوں کے بعد ہم اس گھنے جنگل میں آگے بڑھے، قدم قدم پر مشکلات پڑتی تھیں، بارش کی وجہ سے جگہ جگہ چھوٹے سے تالاب بن گئے تھے، اور کوئی راستہ تو تھا نہیں اس لئے مجبوراً ہمیں اِن تالابوں ہی میں گھُسنا پڑتا تھا، بعض گڑھے تو اتنے گہرے تھے کہ ہم کمر تک پانی میں دھنس جاتے، جب ایک دوسرے کو پکڑ کر باہر کھینچتے تب اس مُصیبت سے چھٹکارا ہوتا، بعض دفعہ تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے کہ یا خُدا میں یہ کس مُصیبت میں پھنس گیا۔ اپنے ہوٹل میں اگر اسی طرح بیراگیری کر رہا ہوتا تو آج ان تکلیفوں میں نہیں گھِرا ہوا ہوتا مگر اب گزری ہوئی باتوں کو یاد کرکے رونا بے کار تھا۔ اب تو مُجھے یہ سوچنا تھا کہ آگے چل کر مُجھے کیا کرنا چاہیئے۔

کوئی دو گھنٹوں کے بعد ہم ایک چھوٹے سے راستے سے گزر رہے تھے کہ

میں یکایک خچّر کی کمر سے نیچے گِر پڑا۔ گِرتے گِرتے میں نے دیکھا کہ درخت بڑے زور سے ہل رہے ہیں، زمین اس طرح ہچکولے لے رہی ہے جیسے وہ زمین نہ ہو کوئی دریا ہو، ساتھ ہی بڑے زور کی گڑگڑاہٹ اور چٹّانوں کے آپس میں ٹکرانے کا شور بھی سُنائی دیا۔

چیزیں گھومنے لگیں، بڑے بڑے پتھّر اس طرح ہلنے لگے جیسے ربڑ کے بنے ہوئے ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ کُبڑے کی یہ دوسری پیش گوئی ہے جو سچ ثابت ہو رہی ہے۔ جان اور عبدل بھی خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے، عبدل ایک زوردار چیخ مار کر ایک بڑے درخت کے تنے سے جا کر لپٹ گیا۔ اچانک مُجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے پنجے کی زمین سِرکتی جا رہی ہے اور پھر یوں لگا جیسے میں کنویں میں گرتا جا رہا ہوں۔ دھائیں سے ایک آواز آئی اور تکلیف کی وجہ سے میں نے زور کی ایک چیخ

ماری۔ میرے سارے جسم میں بہت درد ہو رہا تھا۔ جب میرے ہوش و حواس درست ہوئے تو میں نے دیکھا کہ میں ایک اندھیرے کنویں میں پڑا ہوا ہوں۔ زمین سے یہ کنواں کوئی پندرہ فٹ نیچے ہو گا۔ مُجھے خیال آیا کہ شاید زلزلے کی وجہ سے زمین پھٹ گئی ہوگی اور یہ کنواں نما گڑھے زمین میں پیدا ہوا ہو گا۔ میں نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ میں کسی گہرے کھڈے میں نہیں گرا اور زلزلے کے بعد اوپر زمین کی سطح برابر نہیں ہوئی، کیوں کہ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر جیتے جی میں ایک اندھیری قبر میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا۔ زمین کے جھٹکے اب ختم ہو گئے تھے۔ اس لیے میں کمبل جھاڑ کر اُٹھا اور چیخ چیخ کر جان کو آوازیں دینے لگا۔ شکر ہے کہ جان نے میری آواز سُن لی۔ وہ دوڑ کر ایک رسّہ لایا اور پھر اِس رسّے کی مدد سے اس نے مُجھے باہر نکالا۔ باہر نکل کر میں نے ایک عجیب بات دیکھی۔ جس حصّے میں ہم لوگ کھڑے

ہوئے تھے زلزلہ صرف وہیں آیا تھا۔ ورنہ دور دور تک دِکھائی دینے والے درخت اور چٹّانیں اسی طرح کھڑی تھیں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس پر زیادہ غور کرنا مناسب بھی نہیں سمجھا کیوں کہ کہ اب میں کُبڑے اور اس کے جادُو سے پوری طرح مرعوب ہو چکا تھا۔

اب مُجھے معلوم ہوا کہ کُبڑا جو کُچھ کہتا ہے بالکل سچ کہتا ہے۔ اور در حقیقت وہ بڑی پُر اسرار قوّتوں کا مالک ہے۔ میں دِل ہی دِل میں سوچ رہا تھا کہ اب اس سے اُلجھنا ٹھیک نہیں۔ اب میں اس کی کسی بات کا مذاق نہیں اڑاؤں گا، اور کوشش کروں گا کہ اس کا ادب کروں، آپ میری اس داستان کو پڑھ رہے ہیں، مُمکن ہے یہاں آ کر یہ سوچیں کہ میں بُزدل تھا جو اس قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ ٹھیک ہے آپ بے شک میرے بارے میں یہ

رائے قائم کیجیۓ، مگر میں پوچھتا ہوں کہ اگر ایسے موقع پر میری جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے؟ یقیناً آپ بھی یہی کرتے اس لیے میں بھی ایسا سوچنے میں حق بجانب تھا۔

خچّروں پر سے زلزلے کی وجہ سے سامان نیچے گر گیا تھا۔ ہم تینوں نے مل کر وہ سامان پھر سے ان کی کمر پر لادا۔ اور پھر دوبارہ اپنا سفر شروع کیا۔ کیونکہ اب تو صرف یہ سفر ہی ہمارے لیے ضروری ہو کر رہ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سفر ہی اب اپنی تقدیر ہے۔ ہماری ٹانگیں ابھی تک لرز رہی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے ہمارے جسم میں ابھی تک زلزلے کے آثار باقی ہیں۔ اپنے خیالوں میں گُم میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بار بار میرا دِل چاہتا تھا کہ کہیں سے کُبڑا نمودار ہو جائے اور میں اُس کے سامنے اپنا سر جھُکا دوں۔ وہ اتنی بڑی شخصیت تھی اور افسوس میں آج تک اُس کا

مذاق اڑاتا رہا۔ شاید میں اپنے اِس خیال کو جان پر ظاہر کر ہی دیتا اگر مُجھے اُس کی آواز سُنائی نہ دیتی۔ وہ مُجھے جلدی جلدی آگے آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جان کے چہرے پر خوشی کے آثار پیدا تھے اور وہ ٹکٹکی باندھے سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اس طرف جب نظر ڈالی تو خوشی کے مارے میرا جسم بھی کپکپانے لگا۔ کیوں کہ سامنے ہی اُس گھنے جنگل کی آخری سرحد نظر آ رہی تھی، سورج کی روشنی اب تیز نظر آنے لگی تھی۔

اندھیرا ختم ہو گیا تھا، اور آدھے فرلانگ کے فاصلے پر جنگل ختم ہوتا دِکھائی دیتا تھا، مگر ایک چیز جس نے میری اور شاید جان کی بھی خوشی کو دوبالا کر دیا تھا (اف! اُس کا نام لکھتے ہوئے بھی میرے ہاتھ خوشی کے مارے لرز رہے ہیں۔) وہ کھنڈرات تھے جو نقشے کے مطابق ہم سے اب کوئی سات

فرلانگ کے فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ ہماری پہلی منزل جس کے لیے ہم نے اتنے پاپڑ بیلے تھے اب ہم سے کتنی قریب تھی!

جان نے مُجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ میں اس اشارے کو فوراً سمجھ گیا کیوں کہ اِس سے پہلے بھی ایسے ہی بہت سے اِشاروں کو میں نے سمجھا تھا اور اِس اِشارے کا مطلب تھا کہ مُجھے رفع حاجت کا بہانا کرنا چاہیے۔ پہلے بھی جب میں نے ایسے بہانے کیے تھے تو جان مُجھے پکڑ کر عبدل اور جیک کی نظروں سے بچاتا ہوا دور جنگل میں لے جاتا تھا اور وہاں کمبل اُتار کر خوب غور سے میرے بدن کو دیکھتا۔ خزانے کی بابت ایک ایک بات کو تفصیل سے نوٹ کرتا، مُجھ سے مشورہ کرتا اور پھر ہم دونوں واپس آ جاتے۔ مگر جب واپس آتے تو ہمارے دماغ خزانے کو ڈھونڈ نکالنے کے حل سے بہت قریب ہوتے اور مزے کی بات یہ کہ ہمارے

دُشمن ہمارے اِن ارادوں سے بالکل واقف نہ ہوتے۔

اس وقت بھی وہ مُجھے جنگل میں ایک طرف لے گیا، اور پھر میرے جسم سے کمبل اُتار کر خزانے کے نقشے کو اچھّی طرح دیکھا۔ نقشہ دیکھ کر اس نے مُجھے بتایا کہ اگر خُدا نے ہماری مدد کی تو ہم آج رات ہی خزانہ پا لیں گے۔ کھنڈرات اب نظر آ ہی رہے ہیں، بس اب صرف زمین دوز بارہ دری تلاش کرنے کے بعد سنگھار کا کمرہ تلاش کرنا ہے۔

آج سے ہزاروں سال پہلے نا معلوم اور گمنام قوم کے یہ محلات اب جس حالت میں کھڑے تھے اسے دیکھ کر دراصل آنکھوں میں آنسو آنے چاہییے تھے مگر ہمارے دِل خوشی سے پُر تھے، کیوں کہ اُن ہی تباہ شدہ محلوں میں ہمارے لیے وہ کُچھ موجود تھا جس کی خواہش ہر انسان کو ہوا کرتی ہے یعنی دولت۔۔۔ لازوال دولت۔

خیر میں بے کار کی باتوں سے یہ صفحہ نہیں بھرنا چاہتا، مختصر یہ کہ ہم لوگ سہ پہر سے پہلے اِن کھنڈرات کے پاس پہنچ ہی گئے۔ اب ہمیں پہلے کی طرح درخت پھلانگ پھلانگ کر راستہ طے نہیں کرنا پڑا۔ بلکہ صاف میدان میں ہم اپنے خچّروں پر سوار ہو کر آئے۔ عبدل ہم سے پیچھے تھا۔ میں بیچ میں اور جان سب سے آگے، احتیاطاً ہم نے اپنے پستول نکال کر ہاتھوں میں لے لیے۔ مانا کہ یہ کھنڈر ہزاروں سال سے ویران پڑے ہوئے تھے مگر کون جانے کہ اِن کے اندر ہمارے دُشمن پہلے ہی سے جا کر چھُپ گئے ہوں!

کھنڈر کی عمارت کبھی اتنی زیادہ اونچی ہو گی کہ یقیناً آسمان سے باتیں کرتی ہو گی مگر اب صرف اس کی دیواریں نظر آتی تھیں۔ اور چھت غائب تھی۔ یہ دیواریں بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں اور ان کی دراڑوں میں اب گھاس

اُگ رہی تھی، کائی اُن پر اتنی جمی ہوئی تھی کہ اگر کوئی اُن پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو یقیناً نیچے آ گرتا۔ چاروں سمت نحوست منڈلاتی محسوس ہو رہی تھی، بالکل ہُو کا عالم تھا، سنّاٹا۔۔۔ گہری خاموشی!

اور اس خاموشی میں پرانی طرز کی یہ ٹوٹی پھوٹی عمارت اور بھیانک معلوم ہوتی تھی۔ اِن کھنڈروں کو دیکھنے ہی سے خوف معلوم ہوتا تھا۔ اب ذرا خود سوچیئے کہ اِس عمارت کے دروازے میں داخل ہونا کتنی ہمّت کا کام تھا؟

آخر یہ ہمّت کا کام بھی جان نے ہی انجام دیا۔ جیسے ہی اُس نے ٹوٹے ہوئے اُونچے سے دروازے میں قدم رکھا اُلّوؤں کا ایک جوڑا ہُوہُو کی آواز لگاتا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ اُن کے پیچھے پیچھے چمگادڑوں کا ایک غول چیختا چلّاتا آیا اور ہمارے سروں پر منڈلانے لگا۔ صرف یہی دو جان دار ہمیں وہاں نظر آئے، ورنہ کسی بھی جاندار چیز کا گزر وہاں ناممکن

تھا۔ ہم لوگ تو بہت سخت جان تھے جو کسی نہ کسی طرح اس جگہ تک آ پہنچے تھے۔ میرا اور عبدل کا حلق ڈر کے مارے خشک ہو رہا تھا، ہم نے فوراً ایک چھاگل سے بہت سارا پانی پی لیا۔ البتّہ جان اُسی ہمّت اور بہادری کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

شام ہونے والی تھی، اُلّو اور چمگادڑاب ہزاروں کی تعداد میں کھنڈر کے اوپر منڈلا رہے تھے شاید وہ اپنے اپنے آشیانوں میں جا کر دُبکنے کے لیے بے قرار تھے۔ جان ایک پرانے صحن میں کھڑا ہوا چاروں طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں نقشے میں دِکھائی گئی کوئی عمارت تھی جسے وہ تلاش کرنا چاہتا تھا، میرے خیال میں اُسے نا اُمّیدی ہوئی، کیونکہ وہ تھک کر ہمارے پاس آ کھڑا ہوا اور پھر عبدل سے بولا:

"یہ رات اگر ہم لوگ اِس سامنے والے کمرے میں بسر کر لیں تو ٹھیک

ہے۔ کیوں کہ رات کو ہم خزانہ ہرگز تلاش نہیں کر سکتے، ہماری تمام ٹارچوں کی بیٹری بھی اب کمزور ہو گئی ہے، اس لیے اب سوائے مشعل کے اور کوئی چیز روشنی نہیں دے سکے گی۔ اس پرانے کمرے میں ہم مشعلیں جلا کر آرام سے سو جائیں گے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہمیں یہاں کسی قسم کا خطرہ بھی پیش نہ آئے گا۔"

"خطرہ! خطرہ کیوں پیش نہ آئے گا؟" عبدل نے جلدی سے خوفزدہ لہجے میں کہا:

"آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ زمین پر سانپوں کے چلنے کے نشانات صاف دِکھائی دے رہے ہیں، میں بھلا ایسی جگہ آرام سے کس طرح سو سکتا ہوں، جہاں ہر وقت سانپوں کی پھنکاریں سُنائی دیتی ہوں اور جہاں زندگی ہر وقت خطرے میں ہو۔"

”لیکن پھر اس کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ یہ سُن کر عبدل بغلیں جھانکنے لگا۔ واقعی اس وقت ہم تینوں سخت خطرے میں گھِرے ہوئے تھے۔ ایک خطرہ تو یہی تھا کہ ہم صدیوں پرانے کمرے کی خاک پر کس طرح سوئیں جب کہ اس خاک پر ہر سائز کے سانپوں کے لہرانے کے نشان تھے۔ اگر باہر سوتے ہیں تو اپنی حفاظت کے لیے کُچھ نہیں کر سکتے اور فرض کر لیجئے کہ کسی طرح ان دونوں خطروں پر ہم قابو پا بھی لیتے تو تیسرا اور سب سے بڑا خطرہ۔۔۔ یعنی ہمارے دُشمن جیک اور وہ کُبڑا!

بڑی لمبی بحث کے بعد آخر کار یہ طے پایا کہ ہم اندر ہی سوئیں اور باری باری ایک ایک آدمی کمرے کے دروازے پر پہرہ دیتا رہے۔ ہم نے مل جل کر سوکھے ہوئے پتّوں اور درختوں کی چھال میں چربی ملا کر مشعلیں بنائیں۔

دو مشعلیں جلا کر ہم نے کمرے کے اندر لگا دیں۔ اس کے بعد جہاں تک ممکن ہو سکا کمرے کی اچھّی طرح صفائی کرڈالی۔ سانپوں کے بِلوں کو بھی پتھرّوں سے بند کر دیا۔ رات ہو چکی تھی۔ عجیب عجیب آوازیں آ رہی تھیں۔ اِن آوازوں میں اُلّو کی آواز سب سے ڈراؤنی لگ رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی چیز کے سر سرانے کی آواز سُنائی دیتی اور پھر سنّاٹا چھا جاتا۔ نیند کس کم بخت کو آنی تھی۔ بس میں اور جان آنکھیں زبردستی بند کیے پڑے تھے۔ عبدل بندوق سنبھالے پہرہ دے رہا تھا۔ پہلے چار گھنٹے جاگنے کی باری اُس کی تھی اِس لیے وہ چوکنّا ہو کر پہرہ دے رہا تھا۔

آخر نیند آ ہی گئی، عرصے کی تھکن سوار تھی۔ مُجھے ایسا لگا جیسے سونے سے پہلے میں نے اپنے تمام گھوڑے بیچ دئیے ہوں۔ پھر مُجھے عجیب سے ڈراؤنے خواب نظر آنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ جیک اپنا تیز دھار والا خنجر

لیے مُجھے مارنے کے لیے مُجھ پر جھُکا چلا آ رہا ہے۔ ڈر کر میں نے چیخ ماری، اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مگر یہ دیکھ کر میرے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی کہ ایک سایہ مُجھ پر جھکا ہوا ہے، یہ خواب ہر گز نہ تھا، اس لیے کہ اُس سائے نے ہلکی مگر خوفناک آواز میں مُجھ سے کہا:

"خبردار! چُپ چاپ میرے ساتھ باہر آ جاؤ۔ ذرا بھی ہلے تو بندوق کی گولی تمہارا کام تمام کر دے گی۔"

میں نے خیریت اِسی میں سمجھی کہ اُس آواز کا کہنا مان لوں۔ میں خاموشی سے باہر آ گیا۔ اب اس سائے نے اپنے ہاتھوں میں ایک مشعل بھی لے لی تھی۔ اس کی روشنی میں جب میں نے اس سائے کو دیکھا تو حیرت کے مارے میری چیخ نکل گئی۔

میرے سامنے عبدل کھڑا تھا۔

جی ہاں عبدل! اُس وقت اُس کے چہرے پر بھیڑیوں جیسی درندگی برس رہی تھی۔ اسے میں نے اِس رنگ میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مُجھے بڑا تعجّب ہوا کہ آخر اِسے اچانک کیا ہو گیا؟

"کیا بات ہوئی عبدل۔۔۔؟" میں نے اُس سے پوچھا۔ "مُجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

میری بات کا جواب دیئیے بغیر وہ بولا: "میں اگر چاہتا تو تمہیں وہیں کمرے میں ختم کر سکتا تھا، مگر میں نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ میں تُم سے خزانہ کا نقشہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، وہ نقشہ جو اس وقت تمہارے ذہن میں محفوظ رہے۔"

"وہ نقشہ اُس کے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔" کہیں اندھیرے میں سے آواز سُنائی دی۔ میں نے اِس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پھر

اندھیرے میں مُجھے ایک دوسرا سایہ ہلتا ہوا نظر آیا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ میرا سب سے بڑا دُشمن کُبڑا جادوگر لنگڑاتا ہوا ہماری طرف چلا آ رہا ہے، قریب پہنچ کر اس نے کہا۔

"وہ نقشہ اِس کے ذہن میں محفوظ نہیں ہے، بلکہ۔۔۔۔۔ بلکہ۔۔۔ کیوں ننھّے چوہے بتا دوں کہ وہ نقشہ کہاں ہے؟"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے؟" میں نے چلّا کر کہا۔ "کیا تمہیں یاد نہیں کہ نقشہ تمہارے سامنے ہی ہم نے جلا دیا تھا۔"

"یاد ہے، اچھّی طرح یاد ہے۔" کُبڑے نے ہنس کر کہا۔

"مگر جب تُم بُخار میں بُتلا تھے، مطلب یہ کہ جب تُم پر جھُوٹا بُخار سوار تھا تو تمہارے کمبل کی ایک جھلک نے تمہارا راز فاش کر دیا تھا۔ کہو تو اور

تفصیل سے بتاؤں؟"

یہ سُنتے ہی میرا خُون خُشک ہوگیا، تو یہ منحوس اِس راز سے بھی واقف ہے۔ میرے خُدا اب کیا ہوگا، میں اِس جنگل سے کس طرح نکلوں گا، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کُبڑے کی آواز آئی۔

"یہ کمبل اُتار دو پیارے چوہے۔"

اِس کے ساتھ ہی وہ دونوں بدمعاش آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے، اور میرے پورے جسم میں لرزہ پیدا ہونے لگا۔

ذرا میری اُس وقت کی حالت کا اندازہ لگائیے۔ جس راز کو میں نے اپنی سمجھ کے مطابق بڑی حفاظت سے اپنی کمر پر چھپایا تھا، اب وہ ظاہر ہو چکا تھا، اور اس راز سے کون واقف تھا۔۔۔ کُبڑا چیتن۔

میرے لیے یہ وقت اُس لمبے سفر میں سب سے کٹھن تھا، کیوں کہ اس وقت مُجھے دو بڑے بھیانک راز معلوم ہوئے تھے، پہلا تو یہ کہ کُبڑا چیتن نقشے کے راز سے اچھّی طرح واقف ہے اور دوسرا یہ کہ عبدل ہمارا سب سے اچھّا ساتھی اور سب سے بڑا رازدار، خود بھی ہمارے دُشمنوں میں سے ایک ہے۔ اندازہ لگائیے کہ ہماری اِس سے بڑی بد قسمتی اور کون سی ہو سکتی تھی کہ جنھیں ہم نے اپنا سمجھا تھا اب وہی غیر ثابت ہو رہے تھے، کُبڑے کو تو خیر جانے دیجیۓ اُس کا ذکر فضول ہے کیوں کہ وہ شروع ہی سے ہمارا دُشمن تھا، مگر حیرت تو عبدل اور جیک پر ہوتی ہے۔ انھیں کیا ہو گیا؟ سچ ہے سانپ کو چاہے کتنا ہی دودھ پلا کر پالو، مگر وقت آنے پر وہ ڈستا ضرور ہے، عبدل اور جیک دراصل ہماری آستینوں کے سانپ تھے۔

جوں جوں وہ بدمعاش میرے قریب آتے جا رہے تھے، میں سوچ رہا تھا کہ اب ان سے بچنے کا کیا طریقہ ہو؟ اس وقت سوائے خُدا کے اور میرا کوئی مددگار نہیں تھا۔ میں یہ اچھّی طرح جانتا تھا کہ یہ ظالم نقشہ مُجھ سے ضرور حاصل کرلیں گے۔ اور اگر میں نے ذرا بھی انکار کیا تو یہ مُجھے قتل کرنے سے بھی نہ چوکیں گے۔ اپنے انجام کا خیال کرکے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مُجھے یاد آیا کہ جان نے ایک بار مُجھ سے کہا تھا۔

"فیروز، میں نقشہ تمہاری کمر پر مُنتقل نہیں کرسکتا، کیوں کہ اِس طرح تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ دُشمن کوشش کریں گے کہ کسی طرح تمہیں ختم کردیں اور تمہاری کمر پر سے نقشہ حاصل کرلیں۔"

یہ الفاظ یاد آتے ہی میرے آنسو نکل آئے۔ کاش میں اُس وقت جان کا کہنا مان لیتا اور نقشے کو اپنی کمر پر نقل نہیں کراتا۔ مُجھے یقین ہو گیا کہ موت

اب قریب آ گئی ہے۔ یہ ظالم مُجھے ہر گز زندہ نہ چھوڑیں گے۔ نقشہ اگر انہیں مل گیا تو بھلا پھر انہیں میری کیا پرواہ ہوگی۔ مُجھے یہ بھی یقین تھا کہ جان کو ان دونوں نے مل کر ضرور ختم کر دیا ہے۔ ورنہ میرے چیخنے چلّانے کی آواز سُن کر اسے اب تک میری مدد کو آ جانا چاہیے تھا۔

"ہاں تو ننّھے چوہے۔" کُبڑا ایک چمک دار اور تیز دھار والا خنجر نکال کر اُسے میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

"کیوں اب کیا کہتے ہو، تُم سمجھتے تھے کہ تُم ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو، لیکن برخوردار بھلا تم میرے جادُو سے کس طرح بچ سکتے تھے۔ مُجھے تمہاری ایک ایک بات معلوم ہوتی رہی۔ اور تم سمجھتے رہے میں احمق ہوں۔"

اتنا کہنے کے بعد اُس کی آنکھوں میں نفرت پیدا ہو گئی اور بڑی حقارت سے

وہ کہنے لگا: "لیکن موری میں رہنے والے کیڑے تو کیا جانے کہ چیتن کے قبضے میں کیا ہے؟ وہ سب کُچھ دیکھ اور سُن سکتا ہے۔ تیرے فرشتے بھی اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"چیتن باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ کام کی بات کرو۔" عبدل نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

یہ لہجہ سُن کر مُجھے اور تعجّب ہوا۔ کیوں کہ میں نے محسوس کیا کہ اُس لہجے میں حُکم چھپا ہوا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ عبدل کُبڑے جادُوگر کا آقا ہے اور پھر فوراً ہی میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کیونکہ اتنا سُنتے ہی چیتن ادب سے جھکا اور بولا۔

"بہت بہتر، میں اب اِسے اُلٹا لِٹا کر نقشہ دو منٹ میں نقل کر ڈالتا ہوں، آپ ذرا اِسے لِٹانے میں میری مدد کیجئے۔"

"نقل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" عبدل نے بڑی بے رحمی سے کہا۔
"جب ہمیں معلوم ہے کہ خزانہ یہیں کہیں آس پاس دفن ہے تو کیوں کہ اس کی ٹھیک جگہ کا پتہ لگائیں، صرف اتنا دیکھ لو کہ ان کھنڈروں میں آنے کے بعد اب ہمیں کہاں جانا چاہیئے۔ اور اگر یہ احمق لڑکا ذرا بھی چوں چرا کرے تو پھر تمہارے اس خنجر کی تیز دھار کس دِن کام آئے گی؟"

میرے خُدا! کتنے خوفناک الفاظ تھے۔ یہ عبدل بول رہا تھا۔ عبدل جو ان تینوں میں سب سے زیادہ نیک دِل انسان نظر آتا تھا، ذرا سوچیے کہ عبدل جیسا بھولا آدمی جب اچانک اتنا بے رحم بن سکتا ہے تو بھلا جیک کیسا ہو گا، وہ تو صورت ہی سے نہایت ظالم نظر آتا تھا، پھر بھی مُجھے عبدل کی شرافت کا قائل ہونا پڑا جو وہ اس طرح سے پیش آ رہا تھا اگر اس کی جگہ جیک ہوتا تو بغیر کہے سُنے وہ پہلے میرے گولی مارتا اور پھر نقشہ نقل کرتا۔

* * * * * *

"ہاں تو ننھے چو ہے، اب تم مہربانی کر کے زمیں پر اوندھے لیٹ جاؤ، یا اگر تمھیں ننگے جسم زمیں پر لیٹنا پسند نہیں تو پھر اپنا یہ کمبل خاموشی سے اتار دو، مُجھے صرف اتنا ہی دیکھنا ہے کہ یہاں تک آنے کے بعد، اب ہمیں کہاں جانا ہے؟" کُبڑے نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"میں نہ تو کمبل اُتاروں گا اور نہ زمیں پر لیٹوں گا، میں تمھاری باتوں میں ہر گز نہ آؤں گا۔" میں نے چلّا کر کہا۔

"بڑا بہادر ہے بھئی۔" کُبڑے نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: "اِس مُصیبت کے وقت موت کو سامنے دیکھ کر بھی تیرے ماتھے پر بل نہیں۔ سچ ہے ایسی خطرناک مہم پر تُجھ جیسے ہی بہادر لڑکے کی ضرورت تھی، ورنہ جان اگر اسکول میں پڑھنے والے کسی طالب علم کو لے آتا تو وہ تو اب تک کبھی کا

ختم ہوچُکا ہوتا۔ خیر اگر تُجھے وقت سے پہلے مرنا نہیں ہے تو ہمارا کہنا مان لے۔"

"او بے وقوف، موت اور زندگی خُدا کے اختیّار میں ہے، کیا وقت سے پہلے تُجھ جیسا کُبڑا نیولا مُجھے مارے گا، احمق تُجھے اتنا معلوم نہیں کہ موت ہمیشہ اپنے وقت پر آتی ہے۔ وقت سے پہلے کوئی نہیں مرا کرتا۔ اگر ابھی میرا وقت نہیں آیا ہے تو مُجھے سوائے خُدا کے اور کوئی نہیں مار سکتا۔ سمجھا نیولے!" میں نے بڑی حقارت سے جواب دیا۔

کُبڑے کا چہرا یہ نیا خطاب سُن کر غُصّے کے مارے سُرخ ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور میرے قریب آکر اُس نے ایک زور تھپّڑ میرے مُونہہ پر مار دیا۔ اِن سوکھی سی ہڈّیوں میں اتنی طاقت تھی یہ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا، سچ کہتا ہوں کہ تھپڑ کھا کر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا

چھا گیا، میں زمین پر ِگرا اور اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ غُصّے کے مارے وہ بُری طرح کپکپا رہا تھا:

"مُجھ سے مذاق کرتا ہے۔ مُجھ سے۔ کُبڑے جادوگر سے، جو خُدا کا منظورِ نظر ہے، بے وقوف تو اتنا نہیں جانتا کہ اگر میں چاہوں تو تُجھے بکری کی طرح زمیں پر لِٹا کر ابھی ذبح کر ڈالوں، اور پھر تیری کھال اِس تیز خنجر سے اُتار کر اپنے پاس رکھ لوں، پھر تو میرا کیا کر لے گا۔ ارے احمق تُو سمجھتا ہے کہ ہم تُجھ سے ڈر رہے ہیں، جو اس طرح تیری خوشامد کر رہے ہیں، بے وقوف صرف یہ رحم ہے، رحم۔۔۔ مُجھے تُجھ جیسے خوبصورت اور بہادر لڑکے پر رحم آتا ہے اور کُچھ نہیں۔"

"تم پھر وقت ضائع کر رہے ہو چیتن۔" عبدل نے کہا: "میں اِس کم بخت کی ضدّی طبیعت سے اچھّی طرح واقف ہوں، تم اب اُس کی ایک نہ سُنو اور

اُسے قتل کر کے اُس کی کھال اُتار کر اپنے پاس رکھ لو۔" عبدل نے پھر اُسے حُکم دیا۔

اور اِس حُکم کو سُن کر کُبڑے کے چہرے سے رحم کے جذبات اچانک غائب ہو گئے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہو گئی جیسی بِلّی کی آنکھوں میں اپنا شکار دیکھ کر ہوتی ہے۔ میں تو گِرا ہوا تھا ہی، اِس لیے اب وہ اپنا خنجر لہراتا ہوا آہستہ آہستہ مُجھ پر جھُکنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں واقعی مُجھے اپنی موت نظر آنے لگی۔ مُجھے یقین ہو گیا کہ اب یہ مُجھے ہرگز نہ چھوڑے گا۔ جی میں آیا کہ لاؤ اِس آخری وقت میں اِس کم بخت کو کمبل اُتار کر نقشہ دِکھا دوں مگر پھر مُجھے اپنا عہد یاد آیا۔ میں ایک شریف ماں باپ کا لڑکا تھا۔ اور میں نے اپنے مالک جان سے ہمیشہ اُس کا وفادار رہنے کا عہد کیا تھا۔ پھر بھلا اِس وقت یہ عہد کیسے توڑ دیتا؟ ہو سکتا ہے کہ اِن کم

بختوں نے اسے ختم نہ کیا ہو، اور اگر کسی طرح وہ زندہ بچ نکلا ہو تو اُسے یہ جان کر کتنی خوشی ہو گی کہ فیروز مرتے مر گیا مگر اس نے اپنی زندگی میں خزانے کا نقشہ کسی کو نہیں دکھایا۔

میرے اس نیک جذبے نے مُجھ میں اچانک جوش پیدا کر دیا، بُزدلوں کی طرح مُجھے مرنا پسند نہ تھا اس لیے کُبڑا جادُوگر جیسے ہی اپنا خنجر تان کر میرے اوپر آیا میں نے زور کی ایک لات اس کے رسید کی۔ لات اس کے مُونہہ پر پڑی، اور وہ بُری طرح پیچھے گِرا، خوش قسمتی سے اُس کا سر ایک نوکیلے پتھرّ پر پڑا، اس کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔ یقیناً اس کے چوٹ لگی تھی۔ مگر پھرُتیلا کم بخت اتنا تھا کہ چوٹ کا خیال نہ کرتے ہوئے فوراً پھر کھڑا ہو گیا۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اس کی کنپٹی سے خُون نکل رہا ہے، اس وقت وہ بالکل زخمی شیر لگ رہا تھا، اور دوسرے حملے کی تیّاری

کر رہا تھا۔ غُصّے کے مارے اُس کی آنکھیں اُبل رہی تھیں۔ چہرہ اور بھیانک ہوگیا تھا اور کمر کا کُب جلدی جلدی ہل رہا تھا۔ چاقو مضبوطی سے ہاتھ میں تھام کر وہ مینڈک کی طرح اُچھل کر مجھ پر آیا۔ میں تھا تو ایک چھوٹا سا لڑکا مگر اِس وقت میں نے اُس سے مُقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اب اِس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اِس خطرناک کُبڑے سے جیتنا بالکل نا مُمکن ہے، مگر آخری وقت میں تو ایک معمولی سا بکرا بھی قصائی کے سینگ مار دیتا ہے، میں تو پھر انسان تھا اس لیے جیسے ہی وہ مُجھ پر آکر گِرا میں نے زور سے اس کے خنجر والے ہاتھ میں کاٹ کھایا وہ تلملایا تو بے شک مگر اُس نے اپنے ہاتھ سے خنجر نہ چھوڑا۔ اُس نے خنجر والا ہاتھ پھر بُلند کیا اور چاہتا ہی تھا کہ اُس چمکتے ہوئے خنجر کو میرے سینے میں اُتار دے کہ یکایک کہیں سے آواز آئی :

"خبردار! فیروز کو چھوڑدو ورنہ یہ گولی تمہاری کمر کے پار ہو جائے گی۔"

کُبڑا بے شک جادُو گر سہی جیسا کہ وہ خود کہتا تھا مگر گولی کے آگے بھلا کون جی دار ٹھہر سکتا ہے، اُس کا اونچا اُٹھا ہوا ہاتھ وہیں ہوا میں اٹھا ہوا رہ گیا۔ گھبرا کر اُس نے مُجھے چھوڑ دیا۔ اور جلدی سے الگ کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، میں بھی جلدی سے کمبل کو اپنے جسم سے لپیٹ کر اُٹھ گیا۔ عبدل حیرانی سے ہر طرف دیکھ رہا تھا، اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بُری طرح سہما ہوا ہے۔ میں نے بھی غور سے ہر سمت دیکھا، مگر اپنے محسن کو کہیں نہ پا کر بے حد حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہم دونوں کے پیچھے ہی کہیں پستول تانے کھڑا ہو گا، مگر وہ کہیں نہ تھا، میں ابھی ان باتوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ یکایک پھر آواز آئی۔۔

"فیروز! تم آگے بڑھ کر اِن دونوں کے ہتھیار نکال لو، اِس کے بعد میں

انہیں ان کی غدّاری کا بڑا اچھّا سبق دوں گا۔"

آواز سُنتے ہی میرے چہرے پر رونق آ گئی، پہلے میں اِس آواز کو پہچان نہ سکا تھا۔ بلاشبہ آواز میرے مالک جان کی تھی۔ یہ سوچ مُجھے اور بھی خوشی ہوئی کہ وہ زندہ ہے اور ان ظالموں کے چنگل میں نہیں پھنسا۔

"تم سامنے کیوں نہیں آتے، بُزدلوں کی طرح چھُپ کر گولی چلانا چاہتے ہو۔" کُبڑے نے چلّا کر کہا۔

"اور تُم نے تو بڑی بہادری کا کام کیا ہے، ایک ننھّے سے لڑکے پر خنجر لے کر پل پڑے۔ بُزدل کہیں گے، تمھیں اب تمہاری اِس مکّاری کی سزا ضرور دوں گا، فیروز کھڑے کیا سوچ رہے ہو، آگے بڑھ کر ان کے ہتھیار اپنے قبضے میں کیوں نہیں کرتے؟" جان نے دور کسی جگہ سے پُکار کر کہا۔

اُس کی ہدایت کے مطابق میں آگے بڑھا اور پہلے کُبڑے کے ہاتھ سے خنجر لے لیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اِس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ یہ کام کر کے میں عبدل کی طرف بڑھا۔ اِس وقت اُس کا چہرہ غُصّہ کے باعث سُرخ ہو رہا تھا۔ اُس کا ہتھیار وہی ہلال نما عجیب چاقو تھا جس کے بارے میں میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ وہ اُسے گھُما کر پھینکتا تھا، اور دُشمن کو زخمی کر کے وہ چاقو پھر اُس کے پاس واپس آجاتا تھا۔ چاقو لینے کے لیے جیسے ہی میں اُس کے پاس پہنچا، اس نے لپک کر مجُھے دبوچ لیا اور پھر میرے پیچھے چھُپ کر کہنے لگا۔

"لو مسٹر جان اب چلاؤ گولی۔ میں تمہاری آواز سے اندازہ کر چُکا ہوں کہ تُم کس طرف چھُپے ہوئے ہو۔ لو اب چلاؤ گولی۔ تمہیں اپنا وفادار ملازم اگر پیارا نہیں تو گولی ضرور چلاؤ کیونکہ وہ اُس کے سینے کے پار ضرور ہو جائے گی۔"

تھوڑی دیر تک سنّاٹا رہا۔ کوئی آواز نہ آئی اور پھر اچانک سامنے کی چٹان میں سے جان نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی بندوق تھی اور گلے میں کارتوسوں کی پیٹی جھُول رہی تھی۔ ہلکے ہلکے قدم بڑھاتا ہوا وہ آہستہ آہستہ عبدل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عبدل نے مُجھے ابھی تک اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر جان نے کُبڑے سے کہا۔

"چیتن تُم آگے بڑھ کر عبدل کا خطرناک چاقو اپنے قبضے میں کر لو۔ جلدی کرو تُم میرے نشانے کی زد میں ہو۔"

"لیکن آپ یہ بھُول رہے ہیں کہ آپ بھی میرے نشانے کی زد میں ہیں، آپ کی پُشت میرے پستول کی طرف ہے، جتنی دیر میں آپ مُڑیں گے، میرا پستول آگ اُگل دے گا۔ اور آپ زمین پر لوٹتے نظر آئیں گے، آپ کو شاید وہم تھا کہ میرے پاس صرف خنجر ہی ہے، لیکن حضور میں اپنے

بچاؤ کے لیے پستول رکھنے کا بھی عادی ہوں۔ جس وقت آپ کے اِس ننھّے چوہے نے آگے بڑھ کر میرا خنجر لیا تھا تو میں فوراً ہی آہستہ آہستہ اندھیرے میں کِھسک گیا تھا۔ لیکن آپ سمجھتے رہے کہ میں اِسی جگہ کھڑا ہوں، اب میں آپ سے عرض کروں گا کہ آپ میرے نشانے کی زد میں ہیں اِس لیے مہربانی فرما کر آپ اپنی بندوق نیچے ڈال دیجیے۔"

جان کُچھ سوچنے لگا تو کُبڑے نے ایک ہوائی فائرنگ کرنے کے بعد کہا۔

"دیکھ لیجیے میں آپ کو بہکا نہیں رہا۔ اُس ہوائی فائر سے آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، جلدی کیجیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

جان نے مجبوراً اپنی بندوق نیچے ڈال دی اور پھر کُبڑے نے اُسے جو حُکم دیا اِس غریب نے اُسے مانا۔ کُبڑے نے کہا کہ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا

کر کھڑا ہو جائے، جان نے ایسا ہی کیا، پھر مُجھ سے کہا گیا کہ میں زمین پر اوندھا لیٹ جاؤں، مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ اِس پر عبدل نے زور دار ایک گھونسا میرے مُونہہ پر رسید کیا۔ یہ گھونسا اتنا سخت تھا کہ میرا ہونٹ پھٹ گیا اور تکلیف کی تاب نہ لاکر میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مُجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ کُبڑا اپنے خنجر کی دھار پر انگلی پھیر رہا تھا۔ جان اسی طرح درخت سے لگا کھڑا تھا۔ ہاں البتّہ اب اس کے جسم کو رسّیوں کے ذریعے درخت کے تنے سے باندھ دیا گیا تھا۔ عبدل کے ہاتھ میں جلی ہوئی ٹارچ تھی اور اس کی روشنی میری ننگی کمر پر پڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک کاغذ پر کُچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر دوسرے ہاتھ میں ٹارچ ہونے کی وجہ سے اُس کا ہاتھ خالی نہ تھا اور وہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ آخر اُس نے کُبڑے کو آواز دی۔ کُبڑا جادُوگر خنجر ہاتھ میں لیے میری

طرف آیا۔ میں اس وقت ہوش میں تھا مگر جان بوجھ کر میں نے اپنی
آنکھیں بند کر رکھی تھیں، آخر وہ دونوں مُجھ پر جھُک گئے اور میری کمر سے
نقشہ نقل کرنے لگے۔ بڑی بے بسی کا عالم تھا، میرے ہونٹ سے خون
بہہ رہا تھا۔ پورے جسم کی طاقت آپ ہی آپ ختم ہوتی محسوس ہو رہی تھی
اور میرا اسب سے بڑا رفیق اور ہمدرد جان درخت سے بندھا ہوا کھڑا تھا۔

اِس مجبوری کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچ لیا کہ چاہے جان چلی جائے اپنے
بچاؤ کی ایک آخری کوشش اور کروں گا جیسے ہی عبدل اور کُبڑا جھُک کر
نقشے کو دیکھنے لگے، میں نے لیٹے لیٹے فوراً پلٹا کھایا اور پھر چِت ہوتے ہی
اپنے دونوں پیر اُن کے چہروں پر مارے، وہ دونوں زمین پر کمر کے بل جا
گِرے اور پھر فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ مُجھے بڑی حیرت سے دیکھ
رہے تھے، کیوں کہ انہیں اب کم از کم مُجھ سے یہ توقع نہیں تھی کہ اتنا پِٹنے

کے باوجود بھی میں ان پر دوبارہ حملہ کروں گا۔ عبدل کی آنکھوں میں اچانک بے رحمی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے فوراً سیدھے ہاتھ سے پستول نکال کر مُجھ پر تان لیا اور دوسرے ہاتھ سے ٹارچ کی روشنی مُجھ پر ڈال کر کہنے لگا۔

"او کم بخت یہ تُجھ پر رحم کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس بے وقوف کُبڑے کو تو صرف باتیں بنانی آتی ہیں، یہ کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ مگر میں تو کر سکتا ہوں۔ اب بہت ہو چکا، اب مرنے کے لیے تیّار ہو جاؤ۔"

"نہیں، خُدا کے لیے نہیں۔" درخت کی طرف سے جان کی سہمی ہوئی آواز آئی، وہ خود کو آزاد کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ مگر عبدل نے اس آواز کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیا۔ پستول کی لبلبی دبا کر اُس نے اچانک مجھ پر فائر کر دیا۔ مگر یہ کیا؟ درحقیقت وہ بڑی ہی عجیب بات تھی جو میں نے دیکھی۔

گولی چلنے کی آواز ضرور سُنائی دی تھی مگر میں ابھی تک بالکل محفوظ تھا۔ البتّہ عبدل کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے، پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا اور اب اس کے ہاتھ سے خون نکل رہا تھا اور وہ اسے دوسرے ہاتھ سے دبائے ہوئے تھا۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر جان کی طرف دیکھا کہ ممکن ہے وہ کسی طرح آزاد ہو گیا ہو اور گولی اُسی نے چلائی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر مُجھے اور بھی تعجّب ہوا کہ وہ اسی طرح بندھا ہوا کھڑا تھا۔ کُبڑا جادُوگر چوکنّا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ چاند کی تیز روشنی میں مُجھے ان کی ایک ایک حرکت نظر آ رہی تھی۔

"تم دونوں برابر برابر کھڑے ہو جاؤ۔" اچانک اندھیرے کھنڈر میں سے آواز آئی۔

"تُم کون ہو؟" عبدل نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تم دونوں کی موت، احمقو تمہیں شرم نہیں آتی، جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو، اپنے مالک سے غدّاری کرتے ہو۔ میں تمہاری ایک ایک رگ سے واقف ہوں، تم جیسا کمینہ شخص شاید ہی اس زمین پر دوسرا کوئی ہو۔ تم اتنے جلّاد ہو کہ اپنے مطلب کے لیے ایک معصوم لڑکے کا خون لینے سے بھی باز نہ رہے۔ تم نے جو جو سوانگ بھرے میں ان سب کی پول کھول دوں گا۔ فیروز، تم کھڑے کیا تک رہے ہو۔ جاؤ جا کر اپنے مالک جان کو آزاد کرو، اس کے ساتھ ہی اس کمینے عبدل کا پستول بھی اپنے قبضے میں کرلو، کیوں کہ کسی نہ کسی دِن یہ اسی پر استعمال کرنے کے کام آئے گا۔“

میں ابھی تعجّب سے یہ سب باتیں سُن ہی رہا تھا کہ اچانک اندھیرے میں سے کوئی آہستہ آہستہ پستول تانے چاند کی روشنی میں آگیا، اور اب جو میں

نے غور سے اسے دیکھا تو حیرت اور خوشی کی ایک چیخ میرے منہ سے نکل گئی، میرے سامنے جیک کھڑا تھا۔

جیک جو ہمارا سب سے بڑا دُشمن تھا، لیکن جو اس وقت رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا، سچ بات تو یہ ہے کہ ہم اتنے عجیب و غریب حالت سے دوچار ہو چکے تھے کہ اب کسی نئی بات پر یقین کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ جیک کو ہم غدّار سمجھ رہے تھے لیکن اب وہ ہمارا مددگار بنا ہوا تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ اچانک میرے دِل میں خیال آیا کہ کہیں یہ اُن کی ملی بھگت نہ ہو، مُجھ سے ہمدردی جتا کر یہ کوئی کام نہ نکالنا چاہتے ہوں، مگر جب میں نے کُبڑے جادُوگر اور عبدل کے چہروں کو دیکھا تو اپنا یہ خیال بدلنا پڑا۔ وہ دونوں بڑی نفرت بھری نگاہوں سے جیک کو دیکھ رہے تھے اور جیک بھی انہیں اسی انداز سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ

اٹھا کر جلدی سے آگے بڑھ کر جان کے بندھن کھول کر اُسے آزاد کر دیا،
آزاد ہوتے ہی اس نے میری پیشانی چوم لی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم ہندوستانی واقعی قول کے پکّے ہوتے ہو، فیروز، تُم نے مُجھے اب
بالکل اپنا بنا لیا ہے۔ خُدا کی قسم میں نے تم جیسا لڑکا آج تک نہیں دیکھا۔
میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

جان کی یہ باتیں سُن کر میرا سینہ فخر سے تن گیا، میں سوچنے لگا یورپ کے
لوگوں کو اپنی تہذیب اور تمدّن پر کتنا ناز ہے؟ وہ سمجھتے ہیں کہ دُنیا میں وہی
سب سے افضل اور تہذیب یافتہ ہیں، لیکن اس وقت انگریز قوم کا ایک
شخص مُجھے جیسے معمولی اور غریب لڑکے کی کتنی تعریف کر رہا تھا۔ کیا یہ
حیرت کی بات نہیں تھی، ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے کیا مُجھے اس
پر ناز نہیں کرنا چاہیے تھا؟

جیک کے جبڑوں کی ہڈّیاں بار بار دب اور اُبھر رہی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے اسے دُشمنوں پر سخت غُصّہ ہے اور جیسے انہیں کچّا چبا جانا چاہتا ہے۔ جان نے مُجھے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا اور محبّت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میری کمر تھپتھپا کر اس نے کہا: "بخدا میں تُم پر جتنا بھی ناز کروں، کم ہے۔ تُم نے آج وہ کام کر دِکھایا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"شکریے کو تو چھوڑیئے اور پہلے جیک کی مدد کیجئے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کہیں یہ دونوں اُس پر جھپٹ نہ پڑیں۔"

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے، مگر مُجھے بار بار جیک کے اس رویّے پر حیرت ہو رہی ہے، آخر یہ سب کیا ہے؟"

"آپ کے ساتھ مُجھے بھی حیرت ہے، لیکن یہ باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے

ہمیں جیک کے پاس پہنچنا چاہیئے۔"

جان کی بندوق درخت کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔ شاید دُشمنوں نے بھول سے اپنے قبضے میں نہیں کیا تھا، ان کا خیال ہو گا کہ ہم دونوں کو مرنا تو ہے ہی، اس لئے بھلا ہم بندوق سے کیا کریں گے؟ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ آزاد ہو جانے کے بعد بندوق پھر ہمارے قبضے میں آجائے گی تو وہ ہرگز اُسے وہاں نہ رہنے دیتے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا، اُن کی ہر سوچی ہوئی بات اُلٹی ہو رہی تھی۔

جب ہم جیک کے پاس پہنچے تو وہ کُبڑے جادُوگر سے کہہ رہا تھا۔

"تُم ذلیل انسان! تمہاری حقیقت کیا ہے؟ میں چاہوں تو تمہیں چُٹکیوں میں مسل کر رکھ دوں۔ مگر میں ہمیشہ خاموش رہا۔ میں اپنے ساتھی جان کے ساتھ غدّاری کرنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر تم دونوں کا

شروع ہی سے یہ خیال تھا، ہم افریقی رنگ کے تو کالے ہوتے ہیں، مگر ہمارے دِل کالے نہیں ہوتے۔ ہمارا خون تمہاری طرح سفید نہیں ہوتا، ہم جس کے ایک بار ہو جاتے ہیں بس ہمیشہ اس کے وفادار رہتے ہیں، تمہیں معلوم ہے کہ میں جان بوجھ کر گونگا کیوں بنا ہوا تھا؟"

وہ دونوں خاموش رہے تو جیک نے غُصّے سے چلّا کر کہا۔

"جواب دو، جواب کیوں نہیں دیتے۔"

"ہمیں نہیں معلوم۔" کُبڑے نے خوف کے مارے لرزتے ہوئے کہا اور مُجھے اُس پر بڑی حیرت ہوئی کہ جادُوگر ہو کر بھی وہ خوف کے باعث کپکپا رہا ہے۔ میں بتاتا ہوں، جیک نے زہریلی مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "سنو۔۔۔ اور آپ بھی سنئے مسٹر جان! میں ان دونوں کا پول کھول رہا ہوں، عبدل کو آپ نے اپنا ساتھی بنانے سے پہلے یہ نہیں سوچا کہ آیا یہ

شخص وفادار بھی ہے یا نہیں۔ میں چوں کہ آپ سے وفادار رہنے کا عہد کر

چُکا تھا اس لیے مجھے سوچنا پڑا کہ جس شخص کو ہم اپنا ساتھی بنا رہے ہیں وہ

دراصل ہے کیسا؟ میں نے آپ سے نیویارک میں ہی یہ بات کہہ دی تھی

کہ عبدل اچھّا آدمی نہیں ہے مگر آپ نے اس کا جواب دیا تھا کہ وقت

اسے اچھّا بنا دے گا لیکن اب آپ دیکھ لیجیے کہ وقت نے اُسے کتنا بُرا بنا

دیا ہے۔ مُجھے فیروز کی عقل کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے شروع ہی

سے اِس کُبڑے پر نظر رکھی۔ یہ بد معاش دراصل نیچ ذات کا ہے۔ پھر

عبدل نے ہندوستان آتے ہی اسے پٹّی پڑھائی کہ وہ ایک جادُوگر کی سی

اداکاری کرے اور ہم لوگوں کے سامنے بار باراس طرح آئے کہ ہم اس

سے ڈر جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں کی اسکیم کامیاب رہی

اور آپ سچ مچ سہم گئے کیونکہ یہ احمق عجیب عجیب باتیں کرتا تھا۔ فیروز کی

عقل مندی سے نقشہ اُس کے ہاتھ نہیں لگا تو ایک دِن میں نے اسے اپنے خیمے میں بُلا کر گفتگو کی۔ میں نے اُسے ہیرے کی ایک انگوٹھی انعام میں دی اور کہا کہ عبدل کی طرح میں بھی آپ کا دُشمن ہوں اگر یہ نقشہ عبدل کی بجائے مُجھے دے دے تو میں اسے افریقہ لے جاؤں گا اور وہاں سونے کی کانوں کا مالک بنا دوں گا۔ یہی وقت تھا جب فیروز نے مُجھے خیمے میں اِس سے باتیں کرتے سُنا اور مُجھ سے بد گمان ہو گیا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ آپ مُجھ سے بد گمان ہو جائیں اور اس طرح میں آپ کی زیادہ حفاظت کر سکتا تھا، اس کے بعد جو کُچھ بھی ہوا وہ سب کُچھ آپ کو معلوم ہے۔ اس کُبڑے احمق نے کُچھ عجیب و غریب پیش گوئیاں کیں جو سچ ثابت ہو گئیں۔ مگر کس طرح؟ آپ سُنیں گے تو حیرت زدہ رہ جائیں گے، میں گھوم پھر کر سب معلوم کر چُکا ہوں۔ اِس جنگل کے مغربی حصّے میں ایک ایسی قوم آباد

ہے جس تک ابھی تہذیب کا گُزر نہیں ہوا، چیتن کی عقل کی داد دینی پڑتی ہے کہ اُس نے جادُو کے کُچھ عجیب سے کرتب دِکھا کر اُس قوم کو اپنا بنا لیا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ جادُو جانتا ہے، جادُو وادو کُچھ نہیں، بلکہ اِسے مداریوں کے سے کُچھ شُعبدے معلوم ہیں، انہیں دِکھا کر یہ دوسروں پر اپنا رُعب ڈال دیتا ہے۔ خبردار چیتن ہلومت۔"

جیک نے کُبڑے کو بُری طرح ڈانٹا کیوں کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کُبڑے کے چہرے پر اس وقت زردی چھا رہی تھی اور چاند کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بھی ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"اس نے اِس وحشی قوم سے اُن کے دیوتا بنوائے۔ یہ دیوتا دو بُت تھے جو لکڑی اور کاغذ سے بنائے گئے تھے جب آپ سب جنگل کے درمیان سے گُزرنے لگے تو یہ بُت آپ پر اسی قوم نے گرائے تھے جو جنگل میں

چھُپی ہوئی تھی۔ کُبڑے نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ آپ لوگ انہیں تباہ و برباد کرنے آئے ہیں۔ اگر وہ اپنے دیوتا آپ پر گرا دیں گے تو آپ مر جائیں گے اور وہ قوم زندہ رہے گی۔ وہ کالے کلوٹے جاہل لوگ اس کی باتوں میں آ گئے اور نتیجہ کے طور پر بُت آپ پر گرے، مگر اس بات کا پہلے ہی انتظام کر لیا گیا تھا کہ بُت کہیں درخت ہی میں اٹک کر رہ جائیں تاکہ آپ لوگوں پر یہ قلعی نہ کھُلے کہ وہ کاغذ اور لکڑی کے بنے ہوئے ہیں، بلکہ آپ انہیں پتھر ہی کا سمجھتے رہیں۔"

جیک کی یہ باتیں میں اور جان بڑی حیرت سے سُنتے رہے۔ کُبڑا چیتن اور عبدل اتنے چالاک ہوں گے ہمیں اس کا ذرا بھی گمان نہ تھا۔ پھر بھی میرے دِل میں ایک سوال پیدا ہوا اور آخر میں نے جیک سے پوچھ ہی لیا۔

"اور مسٹر جیک۔۔۔۔۔۔وہ زلزلہ؟ میں سمجھتا ہوں وہ زلزلہ بھی بالکل

مصنوعی تھا؟"

"بالکل ٹھیک سمجھے فیروز!" جیک نے تعریفی نظروں سے مُجھے دیکھتے ہوئے کہا، راتوں رات زمین میں ایک گڑھا کھودا گیا اور اس پر لکڑی کے تختے بچھا دیے گئے اور اوپر سے ان تختوں پر مٹّی ڈال دی گئی۔ کُبڑے کے آدمیوں نے وہ تختے نیچے سے ہلائے، زمیں پھٹ گئی اور تُم ایک خاص گڑھے میں گِر گئے، جو پہلے ہی سے اس مقصد کے لئے تیّار کیا گیا تھا۔ کُبڑا تمہیں دیکھتا رہا، تمہارے کمبل کے اڑنے سے تمہاری کمر ننگی ہو گئی اور کُبڑا تمہارا راز جان گیا۔"

"آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں، مسٹر جیک۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"زلزلہ کے وقت مُجھے خود یہی محسوس ہوا تھا کہ زلزلہ صرف ایک خاص حصّے میں آیا تھا حالانکہ اُسے پورے جنگل میں آنا چاہیئے تھا۔ لیکن مسٹر جیک میں

ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھو!" جیک نے کُبڑے کو دیکھتے ہوئے کہا جو پھر ہلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کُبڑے کے وہ ساتھی جِن کے بارے میں آپ نے کہا ہے کہ وحشی ہیں اب کہاں ہیں؟ ایسا تو نہیں کہ وہ اس نیولے کی مدد کرنے یہاں آ پہنچیں، تب تو ہم مُصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، وہ لوگ اب اِدھر نہیں آ سکتے، ایک تو وہ اِن سب کھنڈرات کو بہت مقدس خیال کرتے ہیں اِس لیے اِدھر کا رُخ نہیں کر سکتے، دوسرے میں جو اتنے عرصے غائب رہا تو خالی ہاتھ نہیں بیٹھا رہا، کُچھ نہ کُچھ کر کے ہی آیا ہوں۔" جیک نے آہستہ سے جواب دیا۔

"جیک مُجھے تُم پر فخر ہے۔" جان نے خوش ہو کر کہا۔ "تمہارے بارے میں ہم نے غلَط رائے قائم کرلی تھی، معاف کرنا۔"

جیک نے جواب تو کُچھ نہیں دیا بلکہ مُسکرانے لگا، اِس کے بعد وہ کُبڑے کی طرف مُڑا اور خوف ناک آواز میں کہنے لگا:

"چیتن، تُم خود ہی بتاؤ کہ تم کون سی موت مرنا پسند کرو گے۔ اِس کا فیصلہ میں تم پر ہی چھوڑتا ہوں۔"

"مُجھے معاف کر دو، میں بالکل بے قصور ہوں، مسٹر جان! مُجھے معاف کر دیجئے۔" کُبڑے نے یکایک کہنا شروع کر دیا اور اس کی یہ حالت دیکھ کر عبدل نے غُصّے میں آ کر زور سے زمین پر تھوک دیا۔ گویا اُس نے حقارت ظاہر کی تھی، کُبڑے کی یہ بُزدلی اُسے پسند نہیں آئی تھی، جیک یہ دیکھ کر زور سے ہنسا اور پھر بولا:

”تمہاری حالت اِس وقت عجیب ہے، ابھی کُچھ دیر پہلے تم ایک مظلوم لڑکے کو قتل کرنے والے تھے، اوراب معافی مانگ رہے ہو۔ دُنیا کے ظالم لوگ ظُلم کرتے وقت یہ کیوں بھُول جاتے ہیں کہ ایک دِن کہیں انہیں بھی معافی مانگنی نہ پڑ جائے۔ بہر حال تمہیں معاف نہیں کیا جائے گا، میں نے تمہارے بارے میں یہ سوچا ہے کہ جس گڑھے میں تم نے فیروز کو گِرایا تھا، اِسی جیسے ایک گڑھے میں تمہیں گِرا کر اُسے اوپر سے مٹّی سے ڈھک دیا جائے۔“

”نہیں۔۔۔۔“کُبڑا خوف کے مارے بُری طرح چلّایا:

”ایسا غضب مت کرو، مُجھے معاف کر دو، میں ظالم نہیں ہوں، مُجھے ظلم کرنے پر عبدل نے مجبور کیا تھا، جو سزا دینی ہے اِسے دو، میں بالکل بے قصور ہوں۔ مُجھے لالچ نے اندھا کر دیا تھا، مگر یہ سب کُچھ اِس بدمعاش

عبدل کا کیا دھرا ہے، اِسے سزا دو اور مُجھے چھوڑ دو۔"

"او احمق کُبڑے! چُپ رہ۔" عبدل کافی دیر کی خاموشی کے بعد آخر کار ایک خوف ناک آواز میں بولا:

"موقع ملتے ہی میں تُجھے تیری غدّاری کا ایسا سبق دوں گا کہ تو ہمیشہ یاد رکھے گا۔"

"اگر تم زندہ رہے، کیوں کہ میرا ارادہ ہے کہ چیتن کے ساتھ تمہیں بھی زمین میں زندہ دفن کر کے تمہاری قبر پر ایک اہرام بنوا دوں۔ تم مصری ہو نا، اس لیے بولو کیا خیال ہے؟" جیک نے مُسکرا کر کہا۔

"اہرام تیری قبر پر بنے گا حبشی کی اولاد۔" عبدل نے چیخ کر کہا:

"اِس دُنیا میں ایسا کوئی جی دار نہیں جو عبدل کو مار سکے، کیونکہ عبدل اِس

ہتھیار سے خود کو بچانا جانتا ہے۔"

اِتنا کہتے ہی عبدل نے اپنا وہی چاند نما خنجر لہرا کر جیک کی طرف پھینکا اور پھر جو بھی ہونا تھا وہ ایک سیکنڈ میں ہو گیا، جیک کے بجائے عبدل زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا اور وہ عجیب سا مُڑا ہوا خنجر جیک کے ہاتھ میں تھا۔ عبدل بُری طرح چیخ رہا تھا چاند کی اِس ہلکی روشنی میں دیکھنے کی اب مُجھے کافی عادت ہو گئی تھی، آنکھیں پھاڑ کر جب میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عبدل کی ران سے خون بہہ رہا ہے۔

"کیوں اب کیوں پڑے سِسک رہے ہو؟" جیک نے بے دردی سے کہا۔ "بے وقوف آدمی، تُم اتنا نہیں جانتے کہ یہ ہتھیار اصل میں ہم افریقی لوگوں کی ایجاد ہے۔ جب ہم اسے استعمال کرنا جانتے ہیں تو اس سے بچنے کا گُر بھی جانتے ہیں، تم سمجھتے تھے کہ تمہارا یہ ہتھیار مُجھے زخمی کر کے

تمہارے پاس واپس چلا جائے گا، مگر احمق انسان دیکھ لے کہ اب کیا ہوا؟ تو خود ہی زخمی ہوگیا ہے اور تیرا یہ چاقو تُجھے زخمی کر کے اب میرے پاس واپس آگیا ہے۔"

"مُجھے معاف کر دو جیک۔" عبدل نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری چالاکی سے واقف نہ تھا، اب ہم دونوں تم سے اور جان سے معافی مانگتے ہیں، یقین کرو، اب ہم کبھی غدّاری نہیں کریں گے۔"

"نہیں، تُم دونوں کو اب ہمارا ساتھ چھوڑ دینا ہو گا۔" جان نے بڑی دیر بعد اِس گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"ایسا ظُلم مت کیجیے۔" کُبڑے نے عاجزی سے کہا:

"اِس طرح تو ہم مر جائیں گے، ہمارے پاس اب کوئی ہتھیار نہیں ہے،

ہتھیار کے بغیر ہم کس طرح اس بھیانک جنگل میں واپس جا سکتے ہیں؟"

میں نے یہ سُن کر مُسکرا کر کہا۔ "تمہارا جادُو پھر کس دِن کام آئے گا۔ اپنے جادُو کے زور سے ایک بندوق بنا لو۔"

"ٹھیک ہے فیروز، بیٹا اب تُمہیں میرا مذاق اُڑانے کا پورا حق پہنچتا ہے۔" کُبڑے نے سر جھُکا کر جواب دیا، وہ واقعی شرمندہ تھا۔

"اچھّا، میں تمہاری یہ درخواست مان لیتا ہوں، مُجھے تم پر رحم آتا ہے، تُم اب ہمارے ساتھ ہی رہو گے، مگر یاد رکھنا اگر آئندہ تم نے ہم سے غدّاری کی تو انجام اچھّا نہ ہو گا۔" جان نے بندوق اپنے کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

جیک نے اس بات پر بہت زور دیا کہ اُن دونوں کو فوراً ختم کر دیا جائے۔

اُس کا خیال تھا کہ بچھّو ڈنک ضرور مارتا ہے، مگر جان نے اس خیال سے اتّفاق نہیں کیا۔ اور مجبوراً جیک کو جان کی بات ماننی ہی پڑی۔ اس کے بعد ہم نے عبدل کی مرہم پٹّی کی، عبدل واقعی اب شرمندہ تھا اور کُبڑے کی بھی کُچھ ایسی ہی حالت تھی۔ اس کی نگاہیں نیچی تھیں اور اب وہ مُجھ سے نظر ملا کر بات بھی نہ کرتا تھا۔ اگر سچ پوچھئے تو میں بھی ان دونوں سے خوف زدہ تھا۔ میں نے دِل میں سوچ لیا تھا کہ چاہے سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکلنے لگے مگر میں ان دونوں بدمعاشوں کا کبھی اعتبار نہ کروں گا۔

*****

رات بغیر کسی خاص واقعے کے آرام سے گُزر گئی۔ وہیں بارہ دری کے قریب ہم نے زمین صاف کر کے دوبارہ بستر بِچھا دیے اور پہلے کی طرح

باری باری پہرہ دے کر آرام سے سوتے رہے۔ صُبح ہوئی تو بندروں کے ایک غول نے ہمیں خوں خوں کر کے جگایا۔ بار بار وہ ہمارے قریب آتے اور بھبکی دیتے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتے، اُن کی اِن حرکتوں سے میں بہت خوش ہوا۔ دِن بھی خُدا نے کیا چیز بنائی ہے۔ ہر قسم کا ڈر اور خوف اُس کی روشنی میں ختم ہو جاتا ہے۔ صُبح ہوتے ہی ہماری تھکن دور ہو گئی اور ہم نے پھر سے تازگی محسوس کی۔ اب چونکہ عبدل اور کُبڑے سے نقشہ کا راز چھپانا ضروری نہ تھا۔ اس لیے جان اور جیک نے اُن دونوں کے سامنے ہی میرا کمبل ہٹا کر خزانہ کا نقشہ دیکھا، نقشے میں دِکھائے گئے راستے سے ظاہر ہوتا تھا کہ جس جگہ ہم کھڑے ہیں اس کے شمال مغرب میں پچیس گز کے فاصلے پر ایک زینہ ہے اور یہی زینہ اُس مقام پر جاتا ہے جہاں خزانہ موجود ہے۔ خزانے سے خود کو اِس قدر قریب محسوس کر کے ہر

ایک کے چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑ گئی، یکایک سب میں کام کرنے کا جوش پیدا ہوگیا۔ خچرّوں پر سے ضروری سامان اُتارا گیا۔ عبدل کے ذمّے یہ کام لگایا گیا کہ جب جان فاصلہ ناپ کر اُسے جگہ بتائے تو وہ فوراً کھدائی شروع کردے۔ عبدل اب ہمارا ہر حُکم ماننے پر مجبور تھا، اس لیے جان نے جب اسے وہ جگہ بتائی جہاں کھُدائی کرنی تھی تو اُس نے کدال اور پھاوڑا لے کر اپنا کام شروع کردیا۔ کُبڑا مٹّی ہٹاتا جاتا اور عبدل لگاتار کدال زمین پر چلاتا جاتا۔ ہم حیرت، اشتیاق اور تعجّب سے اُس جگہ کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ابھی کوئی عجوبہ دیکھیں گے۔

اور سچ بات تو یہ ہے کہ وہ عجوبہ جلد ہی ہمارے دیکھنے میں آگیا۔ ایک بار عبدل نے جب پوری طاقت سے کُدال زمین میں ماری تو وہ ایک خطرناک چیخ مارتے ہوئے زمین میں دھنستا چلا گیا۔ زمین اندر سے کھوکھلی نکلی۔ یہ

بات جان کی مرضی کے مطابق تھی اور اس کی یہی خواہش تھی کہ کہیں سے کسی کھو کھلی زمین کا پتہ چلے، وہ کھو کھلی جگہ اب مل گئی تھی۔ دراصل یہ زینہ تھا جو اوپر سے بند کر دیا گیا تھا۔ عبدل نے جب مٹّی ہٹائی تو وہ اس زینے کے اندر جا گرا تھا۔ پھر فوراً ہی اس کی آواز آئی کہ اس کے قدموں کے نیچے کُچھ سیڑھیاں محسوس ہوتی ہیں، جلدی جلدی باقی سب مٹّی بھی ہٹائی گئی اور اب جو ہم نے غور سے دیکھا تو عبدل ایک زینے کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ آگے جا کر یہ سیڑھیاں ختم ہو جاتی تھیں اور وہاں سے ایک زمین دوز راستہ شروع ہو جاتا تھا۔ جان نے یہ دیکھ کر جلدی سے ٹارچ اٹھائی اور ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کر کے خود بھی اس زینے میں اتر گیا، اب ہم خزانے تک پہنچنے والی زمین دوز سُرنگ میں داخل ہو رہے تھے۔

سرنگ میں داخل ہوتے ہی ہمیں ایسی بدبُو محسوس ہوئی جو کسی جگہ کے

ہزاروں سال تک بند رہنے کے باعث پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں ایسا لگا جیسے کوئی اُن دیکھا ہاتھ ہمارا گلا گھونٹ رہا ہے۔ وہم کے ہم قائل نہیں تھے، جان خود بھی ایک بہت اچھّا سائنس داں تھا، اس لیے اُس نے بتایا کہ آکسیجن کی کمی کے باعث اس سُرنگ میں دم گھُٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ جلدی جلدی مگر لمبے سانس لیں، صدیوں کے بعد یہ دروازہ آج کھُلا ہے، اس لیے ہوا بھی اس میں دیر سے داخل ہوگی۔ ہم نے اس کی ہدایت پر فوراً عمل شروع کر دیا، جوں جوں ہم سُرنگ میں اندر بڑھتے جا رہے تھے اندھیرا اتنا ہی بڑھنے لگا تھا۔ ٹارچ کی روشنی ناکافی محسوس ہرنے لگی تھی۔ ہمارا قاعدہ تھا کہ ٹارچوں کو زیادہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ضرورت کے وقت صرف ایک ٹارچ جلاتے اور باقی بند رہنے دیتے، مگر اس جگہ ہم نے مشعلیں جلالی تھیں۔

ہلکے ہلکے قدم بڑھاتے ہوئے آہستہ آہستہ ہم آگے بڑھتے گئے۔ سُرنگ تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ گھُپ اندھیرا، عجیب قسم کی پُر اسرار خاموشی۔ ختم نہ ہونے والی لمبی سُرنگ، ہلکی سی سرسراہٹ جو نہ جانے سانپوں کی تھی یا شاید زہریلے جانوروں کی۔ ایک انجان سا خوف دِلوں پر طاری تھا۔ کُچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں؟ مُجھے اس ماحول اور ایسی خطرناک جگہوں پر چلنے پھرنے کی اب عادت سی ہو گئی تھی، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں ایسے بہت سے حادثوں سے دوچار ہو چکا تھا، اس لیے اب زیادہ ڈر نہیں لگتا تھا۔ دیکھا جائے تو ان حادثوں کی چکّی میں پِس کر اب میں بے حد نڈر بن چُکا تھا۔

آخر کار ایک وقت ایسا آیا جب کہ یہ سُرنگ آگے جا کے ہمیں بائیں طرف مُڑتی ہوئی دکھائی دی، اُدھر مڑنے کے بعد ہم اندازاً پندرہ منٹ تک لگاتار

چلتے رہے۔ مگر سُرنگ ختم نہ ہوئی۔ عجیب جگہ تھی۔ ہم اُس تنگ سُرنگ میں چلتے چلتے گھبرا گئے تھے۔ مگر خزانے کی خواہش اتنی تیز تھی کہ واپس لوٹا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مجبوراً خُدا پر بھروسہ کر کے ہم آگے ہی آگے چلتے گئے۔ میں آپ سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتا، یقین مانئے کہ پورے تین گھنٹے تک ہم سُرنگ میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے، کبھی یہ سُرنگ دائیں طرف مُڑ جاتی اور کبھی بائیں طرف۔ نا اُمّید ہو کر ہم لوگ واپس لوٹنے ہی والے تھے کہ یکایک سُرنگ میں ہمیں ایک دروازہ نظر آیا۔ دروازے کے کواڑ شیشم کی لکڑی کے تھے، مگر اتنے مضبوط ہونے کے باوجود بھی جگہ جگہ سے کھوکھلے ہو گئے تھے۔ ایک موٹی رسّی سے دروازے میں مہر لگی ہوئی تھی، خُدا جانے وہ کون سے ہاتھ تھے جنھوں نے اس دروازے پر یہ مہر لگائی ہوگی؟ ہم پانچوں سانس روکے ہوئے حیرت سے اس دروازے

کو دیکھ رہے تھے۔۔ یہ وہ دروازہ تھا جس کے کھلتے ہی ہماری تقدیر بھی کھُل جانے والی تھی۔

کُچھ اشتیاق اور کُچھ خوف کے ملے جلے انداز میں جان نے اس رسی کو ہاتھ لگایا، ہاتھ لگاتے ہی رسی اس طرح جھڑ گئی جیسے مٹّی کی بنی ہوئی ہو، پھر جیک نے آہستہ سے دروازہ کو اندر کی طرف دھکیلا، دروازے کی لکڑی کے اندر ہاتھ یوں داخل ہوگیا جیسے وہ لکڑی نہ ہو بلکہ کاغذ ہو۔ کُبڑے اور عبدل کے چہروں پر بے حد خوف چھایا ہوا تھا، اور اس سنّاٹے میں ان کی سانسوں کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ دروازہ کھلتے ہی ہماری آنکھیں چندھیا گئیں، مشعلوں کی ہلکی سی سِسکتی ہوئی روشنی ہیروں کے ایک عظیم الشّان ڈھیر سے ٹکرا کے سورج کی روشنی کے برابر ہو گئی تھی۔ ہیروں سے نکلتی ہوئی کرنوں نے پورے کمرے کو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔

ہمیں جیسے سکتہ سا ہوگیا۔ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ ہماری آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ جگہ جگہ آئینے لگے ہوئے تھے اور اُن آئینوں کے کناروں پر کئی کئی سو قیراط وزنی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سِنگھار کا کمرہ یہی ہے، ہیروں کے علاوہ سونے کے لاتعداد زیور، ایسے زیور جنہیں آج ہم دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں۔ وہاں قرینے سے چنے ہوئے تھے۔ خُدا جانے اتنے بھاری زیورات صدیوں پرانے زمانے کی عورتیں کس طرح پہنتی ہوں گی!

اِس خزانے کی اگر میں تعریف بیان کرنے لگ جاؤں تو میرے خیال میں کئی ہزار صفحے بھی ناکافی ہوں گے، اس لیے آپ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ خزانہ اتنا بڑا تھا، اتنا بڑا تھا کہ پوری دُنیا کے خزانے اِس کے آگے ہیچ تھے۔ اس

خزانے کو دیکھ کر ہم کس طرح زندہ رہے یہ ایک معجزہ سے کسی طرح کم نہیں۔ بس، میں خزانے کی تعریف میں اتنا ہی کُچھ کہہ سکتا ہوں۔

خزانہ دیکھ کر عبدل اور کُبڑے چیتن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، جان نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ حالانکہ اتنی دولت دیکھ کر انسان کو خوشی سے پاگل ہو جانا چاہیئے، مگر ایک لمبی سانس لینے کے بعد اس نے کہا۔

"یہ دولت مُجھے اپنے لیے نہیں چاہیے، مُجھے محل تعمیر نہیں کرنے جو اس خزانے کو پا کر خوشی سے ناچنے لگوں، مُجھے تو اُن اندھے لڑکوں کی قسمت پر رشک آ رہا ہے جن کی آنکھیں اِس خزانے کی مدد سے ٹھیک ہو جائیں گی، مگر آپ لوگوں نے چوں کہ میرے ساتھ ہمدردی کی ہے۔ اتنے لمبے اور کٹھن سفر میں میرا ساتھ دیا ہے۔ اس لئے خزانے کا دسواں حصّہ آپ سب میں برابر بانٹ دیا جائے گا۔ کیا میری یہ بات آپ کو منظور ہے؟"

"ہمیں آپ کی ہر بات منظور ہے۔" صرف عبدل اور کُبڑے نے خوشی سے چلّا کر کہا۔

"بس تو اب ہمیں اس خزانے کو اسی طرح چھوڑ دینا چاہیئے، اور اپنے اگلے سفر کے لیے روانہ ہو جانا چاہیئے، کیوں کہ وہ سفر اس "خزانے سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ سُرنگ کو ہم دوبارہ باہر سے بند کر دیتے ہیں اور تمام اہم نشانات مٹا کر سمندر کی طرف چلتے ہیں، وہاں سے کوئی کشتی لے کر اِس جزیرے کی تلاش کرتے ہیں، جو ہماری اصل منزل مقصود ہے۔ کیا خیال ہے آپ حضرات کا؟"

جان نے مشعل بُجھا کر ٹارچ نکال کر جلالی۔

"بالکل بجا فرماتے ہیں آپ۔" صرف میں نے اور جیک نے جواب دیا، کُبڑا اور عبدل دونوں خاموش رہے۔

"بس تو آئیے اب واپس چلیں۔ "

یہ کہہ کر جان واپس مُڑا، لیکن عبدل اور کُبڑا چیتن بار بار پیچھے مُڑ کر خزانے کے ڈھیر کو دیکھتے رہے، دروازہ دوبارہ بند کرنے کے بعد صرف میں نے ہی یہ محسوس کیا کہ جان کی اِس حرکت سے وہ دونوں بدمعاش خوش نہیں ہیں، میں نے اُن سے چوکنّا رہنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ اس لیے اب اُن کی ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب میری یہ حالت تھی کہ بھرے ہوئے پستول پر ہر وقت میرا ہاتھ رہتا تھا، جان اور جیک کی حفاظت اب بہت ضروری تھی، اور مُجھے یقین تھا کہ یہ پستول کسی نہ کسی وقت ضرور کام آئے گا۔ عبدل ہم سے آگے تھا جان اُس کے پیچھے اور اس کے بعد ہم سب۔ جان نے اپنی ٹارچ عبدل کو دے کر کہا کہ وہ اُس کی روشنی آگے پھینکتا رہے تاکہ سب آسانی سے سُرنگ کا راستہ طے کرتے

رہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ عبدل سُرنگ سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتا ہے، اور پھر مُجھے جس بات کا خدشہ تھا وہ ہو کے ہی رہی۔

سُرنگ ایک بار جیسے ہی دائیں طرف مُڑی، عبدل نے ٹارچ بند کر دی۔ اب چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا اور اِس کے ساتھ ہی کسی کے اندھا دھند آگے بھاگنے کی آواز آ رہی تھی۔ جیک نے گھبرا کر جان سے کہا:

"مسٹر جان، یہ کم بخت ضرور دغا کرے گا، جلدی دوسری ٹارچ جلائیے، اور فیروز۔ تُم کہاں ہو؟"

"جی فرمائیے۔ ۔ ۔" میں نے جلدی سے جواب دیا: "میں آپ کے پیچھے ہوں۔"

"خبردار، کُبڑا جانے نہ پائے۔"

"بے فکر رہیئے، اُس کی کمر سے میرے پستول کی نال لگی ہوئی ہے۔"

"شاباش، مجھے تُم سے یہی اُمّید تھی۔"

اتنا کہہ کر جیک نے بھی اندھیرے میں آگے بھاگنا شروع کر دیا، کیوں کہ جان کو ٹارچ ڈھونڈنے اور اسے جلانے میں کافی دیر لگ گئی تھی، ٹارچ جلتے ہی جان نے بھی جیک کا تعاقب کیا، پستول کو کُبڑے کی کمر سے لگا کر میں نے بھی اُسے آگے بھاگنے پر مجبور دیا۔ اب حالت یہ تھی کہ ہم لگاتار آگے بھاگے جا رہے تھے۔ مگر عبدل کا کہیں پتہ نہ تھا، ہم اُسے نظروں سے اُوجھل ہونے نہیں دینا چاہتے تھے، کیوں کہ ایسے خطرناک دُشمن کو آزاد کر دینے سے ہماری مُہم خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ بھاگتے بھاگتے ہمیں ایک گھنٹہ ہو گیا، مگر عبدل کا پتہ چلنا تھا نہ چلا، جو راستہ پہلے ہم نے آہستہ آہستہ تین گھنٹے میں طے کیا تھا وہی اب بھاگ کر صرف ایک گھنٹہ

میں پورا کرلیا۔ جب ہم اُس جگہ پہنچے جہاں سے ہم پہلی بار اِس سُرنگ میں

داخل ہوئے تھے، تو ہمیں اچانک رُک جانا پڑا۔ کیوں کہ زینہ میں اب مٹّی

اور پتھرّ تیزی سے ِگر رہے تھے، سیڑھیاں ایک حد تک چھُپ چکُی تھیں۔

اگر ہم چاہتے کہ کسی طرح اُچک کر اُوپر کھُلی ہوا میں پہنچ جائیں تو اب یہ تقریباً

نا مُمکن ہو گیا تھا کیوں کہ اوپر کی زمین کھودنے کے بعد جو زینہ نمودار ہوا تھا

اور جس میں ہم پہلی بار داخل ہوئے تھے اب اُس زینے میں عبدل اوپر

سے مٹّی اور پتھرّ ڈال رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ زینہ ہمیشہ کے لیے بند کر کے

ہمیں جیتے جی اِس سُرنگ میں دفن کر دے۔ ایک حد تک وہ اپنے اِس

ارادے میں کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ کیوں کہ زینہ اوپر تک مٹّی سے لبالب

بھر گیا تھا۔ صرف اتنا سا سوراخ باقی رہ گیا تھا، جس میں سے عبدل ہمیں

اوپر کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہمیں تو صرف اُس کے ہاتھ ہی نظر آ رہے تھے

اور اُن ہاتھوں میں پھاوڑا تھا۔ ہم اگر چاہتے کہ کسی طرح گولی چلا دیں، تو ہماری یہ کوشش بے کار ہی جاتی، کیوں کہ مٹّی وہ اس تیزی سے ڈال رہا تھا کہ ہاتھ کا نشانہ نہیں لیا جا سکتا تھا اور پھر یہ بھی ڈر تھا کہ گولی مٹّی میں اِدھر اُدھر ہی دھنس جائے گی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کریں، کیوں کہ سوراخ بند ہونے میں اب کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ دو تین بار عبدل مٹّی ڈالتا تو وہ سوراخ ضرور بند ہو جاتا اور ساتھ ہی ہم سب بھی جیتے جی موت کے مُونہہ میں پہنچ جاتے۔

یکایک مُجھے ایک ترکیب سوجھی، میں نے جلدی سے جان اور جیک کے کانوں میں وہ ترکیب بتائی اور پھر فوراً چیخا۔

"یہ کیا کر رہے ہو عبدل؟"

میرا خیال تھا کہ عبدل جواب دینے کے لیے کُچھ دیر کے لئے ضرور رُک

جائے گا، اور یہی ہوا اس نے فوراً جواب دیا۔

"اپنے بجائے اب تمہیں زندہ دفن کر رہا ہوں، جیک چاہتا تھا نا کہ مُجھے دفن کر کے اہرام بنا دے، اب میں اِس کی قبر پر اہرام بناؤں گا۔"

"لیکن اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟" جان نے چلّا کر پوچھا، اور اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر جیک جلدی جلدی زینے کے اندر کی مٹّی ہاتھوں میں اُٹھا کر سُرنگ میں اندر کی طرف ڈالنے لگا۔ میں اُس کا مقصد سمجھ گیا، جیک کو توقّع تھی کہ مٹّی کم ہونے کے بعد زینہ کے اوپر کی مٹّی خود بخود اندر دھنسے گی اور راستہ ضرور کھلے گا۔

"فائدہ؟" عبدل نے ایک بھیانک قہقہہ لگا کر جواب دیا:

"فائدہ یہ ہو گا مسٹر جان کہ اوپر سے یہ زمین برابر کر دینے کے بعد آپ لوگ

ہمیشہ کے لیے یہاں دفن ہو جائیں گے۔ انسان کی لاش سڑنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے، مشکل سے ایک یا ڈیڑھ ہفتہ۔ یہ عرصہ میں اوپر انتظار کرتے ہوئے گزار لوں گا، جب آپ کے ڈھانچے ہی ڈھانچے رہ جائیں گے تو میں پھر اس جگہ کو دوبارہ کھودوں گا، اور آپ کے ڈھانچوں میں ٹھوکریں مارتا ہوا، خزانے تک پہنچ جاؤں گا پھر کون مُجھے اِس عظیم خزانے کو حاصل کرنے سے روک سکتا ہے؟ کیوں کیسی ترکیب ہے، سُن کر جی خوش ہو گیا نا، آپ میں سے بھلا کسی کو ایسی ترکیب سوجھ سکتی تھی؟"

میرا پورا جسم یہ سُنتے ہی سُن ہو گیا۔ کتنا خوف ناک ارادہ تھا، اگر خدانخواستہ اُس کا یہ ارادہ پورا ہو گیا تو پھر ہمارا خُدا ہی حافظ تھا، یہ سوچ کر میں نے پھر کہا۔

"مگر تمھارا ساتھی، یعنی یہ کُبڑا، اِس کا کیا ہو گا؟"

”وہ غدار ہے، اور اُس کی غدّاری کی یہی سزا ہے جواب اسے ملے گی۔“ اتنا

کہہ کر ظالم نے پھر مٹّی ڈالنی شروع کر دی، خوف کے مارے میں بُری

طرح لرز رہا تھا اور کُبڑا موت کے ڈر سے سہم کر بار بار چیخیں مار رہا تھا،

صرف جان اور جیک سکون سے کھڑے تھے۔ ہماری سمجھ میں کُچھ نہ آتا

تھا کہ اب کیا کریں؟ اس وقت سوائے خُدا کے اور ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا

تھا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ سچّے دِل سے میں نے خُدا سے لَو لگائی۔

اپنے گناہوں سے توبہ کی اور دُعا کی کہ یا اللہ صرف تیری ہی ذات ہے جو

اِس ظالم سے ہمیں چھٹکارا دِلا سکتی ہے، اگر ہماری زندگی باقی ہے تو ہمیں

اس قید سے رہائی دلا۔ دِل میں اتنی دُعا مانگنے کی دیر تھی کہ اچانک مٹّی پڑنی بند

ہو گئی۔ ساتھ ہی بہت چھوٹے سے سوراخ سے ہمیں عبدل کا ہاتھ دکھائی

دینا بھی بند ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی جو عبدل اب مٹّی نہیں ڈال رہا

تھا، حیرت کی بات یہ تھی کہ نہ تو اُس کے قدموں کی آواز سُنائی دے رہی تھی، اور نہ ہی اُس کی اپنی آواز۔ بڑی حیرت کی بات تھی۔ جیک لگاتار اپنا کام کیئے جا رہا تھا اور پھر آزادی کی اُمّید میں کُبڑے نے بھی اُس کی مدد کرنی شروع کر دی۔ جلد ہی میں اور جان بھی جیک کے ساتھ اس کام میں شریک ہو گیئے۔ کم از کم پندرہ منٹ میں ہم نے وہ مٹّی اندر سُرنگ میں پھینک دی، جس نے پہلے زینہ ڈھک لیا تھا۔ جلدی جلدی ہم سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے، پستول ہم تینوں کے ہاتھوں میں تھے۔ خیال تھا کہ عبدل کہیں چھُپا ہوا ہو گا اور ہم اُس کی بے خبری میں اسے جا کر پکڑ لیں گے۔ مگر۔۔۔۔

مگر باہر کا منظر دیکھ کر خوشی کے مارے میرے آنسو نکل آئے، ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میں نے آسمان کی طرف دیکھا، میرا دِل بڑے خاموش

انداز میں خُدا کا شکر ادا کر رہا تھا کیوں کہ خُدا نے میری دُعا سُن لی تھی، عبدل زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ اُس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے، پہلے تو میری سمجھ میں کُچھ نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا لیکن جب میری نظر قریب ہی ایک بِل میں گھُستے ہوئے سانپ پر پڑی تو حقیقت کا پتہ چلا، ظالم عبدل کو ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ زہر اتنا تیز تھا کہ فوراً ہی اپنا اثر بھی کر گیا، اور اب۔۔۔۔ اب عبدل بالکل بے جان تھا۔

ہم نے اُسے عبرت کے ساتھ دیکھا، اور تب ہی یہ حقیقت ہم پر ظاہر ہو گئی کہ دُنیا میں کوئی شخص کسی پر ظلم کر کے خود آرام سے نہیں رہ سکتا۔ اُسے اُس کے ظُلم کی سزا ضرور ملتی ہے، جیک نے عبدل کی طرف ذرا بھی توجّہ نہ دی اور آگے بڑھ گیا۔ ہاں البتّہ کُبڑے نے اسے غور سے

دیکھا، اس وقت اس کے چہرے پر دہشت نظر آتی تھی اور سہمے ہوئے انداز میں وہ عبدل کے حشر کو دیکھ رہا تھا، آخر وہ بھی خاموشی سے ہمارے پاس آ گیا۔

صُبح کے گیارہ بج رہے تھے، دِن کا وقت تھا مگر کھنڈروں کی سنسانی بدستور قائم تھی۔ جان نے سامان باندھتے ہوئے جیک سے پوچھا:

"اس کا۔۔۔ میرا مطلب ہے عبدل کا اب کیا کریں؟"

"ایسے ظالم انسان کو دفن مت کیجئے۔" جیک نے حقارت سے جواب دیا، "بلکہ گِدھوں اور کوؤں کو اِس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھانے دیجئے۔۔ اس کا یہی حشر ہونا چاہیئے۔"

اِس کے بعد وہ کُبڑے سے مخاطب ہوا۔

"اور تم۔۔۔ تُم نے اپنے ایک ساتھی کا انجام دیکھ لیا، خُدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ اب تم سنبھل کر رہنا کیوں کہ ہم سے غدّاری کرنے کے بعد یہ لاٹھی تم پر بھی پڑ سکتی ہے۔"

کُبڑا یہ سُنتے ہی گڑگڑانے لگا، ہاتھ جوڑ کر اُس نے ہم سے وفادار رہنے کا وعدہ کیا اور پھر خود ہی سامان باندھنے میں ہمارا ہاتھ بٹانے لگا۔ کوئی ایک گھنٹے کے اندر ہم پھر اپنے نہ ختم ہونے والے سفر کے لیے تیّار ہو گئے۔

اِس زمین دوز زینہ کا اوپر کا حصّہ ہم نے اِس طرح بند کر دیا کہ اب دوسرا کوئی بھی اُس مقام کو نہیں پہچان سکتا تھا، زمین بالکل برابر ہو گئی تھی، ہاں البتّہ جان نے ایک خاص نشانی وہاں ایسی لگا دی تھی کہ صرف ہم لوگ ہی اس جگہ کو پا سکتے تھے کوئی اور نہیں۔

کھنڈرات سے نکلنے کے بعد ہم ایک چٹیل میدان میں پہنچے، اُس جگہ کی ہوا

سیلی ہوئی تھی، جان نے ہمیں بتایا کہ اب ہم ہندوستان کے بالکل جنوب میں پہنچ گئے ہیں اور سمندر اب ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ ہو سکتا ہے ہم سمندر کے کسی غیر آباد کنارے پر پہنچیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر ہمیں آبادی تلاش کرنی پڑے گی۔ یہاں میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے کپڑے بہت زیادہ پھٹ چکے تھے، میری پتلون جگہ جگہ سے پھٹ رہی تھی۔ ایک پائنچا اوپر تھا تو ایک نیچے، قمیص تو میں نے کبھی کی الگ کر دی تھی، جنوبی ہند میں چونکہ گرمی کافی ہوتی ہے، اس لیے کمبل بھی مُجھے جسم سے الگ کرنا پڑا۔ اب میرا بدن بالکل ننگا تھا، آبادی تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں کمبل ہی سے دوبارہ جسم ڈھانکوں کیوں کہ کمر پر بنا ہوا خزانے کا نقشہ لوگوں کو غَلط فہمی میں بمتلا کر سکتا تھا، اِس لیے مجبوراً اِسی حالت میں ہم آگے بڑھتے گئے۔

کپڑے دوسرے ساتھیوں کے بھی تار تار تھے، دور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ ہم یا تو مجنوں کے خاندان سے ہیں یا پھر بالکل پاگل ہیں۔ اس وقت واقعی ہم عجیب لگ رہے تھے، ایک کُبڑا، ایک کالا حبشی، ایک ادھیڑ عمر کا امریکن اور ایک نو عمر لڑکا۔ ذرا تصور کیجئے ہم لوگ کیسے نظر آتے ہوں گے اور آبادی کی تلاش بہت ضروری تھی، کیوں کہ ایک تو وہاں سے کپڑے لینے تھے اور دوسرے کسی تیز رفتار اسٹیمر یا بادبانی کشتی کا انتظام کرنا تھا۔ بغیر کسی اسٹیمر کے ہم سمندر میں اتنے لمبے سفر پر ہرگز نہ جاسکتے تھے۔

چلتے چلتے شام ہو گئی اور پھر یکایک ہمیں تاڑ کے لمبے لمبے درختوں کا ایک جھُنڈ نظر آیا، اس کے پیچھے گہرا نیلا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ درختوں کے پاس ہی اونچی اونچی چٹّانیں تھیں اور اِن چٹّانوں سے آگے دور تک پانی ہی

پانی تھا۔ اپنی زندگی میں سمندر میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس لیے بہت خوش ہوا۔ ہاں جان البتّہ خاموش تھا، جلد ہی اُس کی اس خاموشی کی وجہ بھی معلوم ہو گئی، کیوں کہ آبادی کے آثار دور دور تک نظر نہ آتے تھے اور ہم ایک بالکل ہی غیر آباد کنارے پر آ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر جان نے کہا :

"ہمیں راتوں رات کوئی نہ کوئی بستی یا چھوٹی سی بندرگاہ ضرور تلاش کرنی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم کسی مُصیبت میں پھنس جائیں گے۔ فیروز کی ننگی کمر لوگوں کو شُبہ میں ڈال دے گی اور میں یہ نہیں چاہتا۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے پوچھا۔

"آبادی کی تلاش، اور کُچھ نہیں۔" جان نے جواب دیا :

"کیوں کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہم اِس وقت ہندوستان کے بالکل

جنوب میں، پالام کوٹہ اور کومورن کے درمیان میں ہیں، ساحل ساحل اگر ہم چلتے چلتے جائیں تو یقیناً کومورن تک پہنچ جائیں گے۔ ہندوستان کے جنوب میں یہی آخری مقام ہے۔"

رات کا وقت تھا، آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے، جدھر بھی نظر جاتی اندھیرا ہی اندھیرا دِکھائی دیتا تھا، جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمیں اس وقت کسی بستی کی تلاش تھی، جہاں سے ہم کپڑے اور بار برداری کا سامان لینا چاہتے تھے، لیکن چونکہ ہم بُری طرح تھک چکے تھے اس لیے ایسے سوئے کہ پھر صُبح بندروں کے ایک غول نے ہمیں خوں خوں کر کے اُٹھایا، ایک بندر میرے سینے پر چڑھا ہوا تھا اور اپنی گلابی پپوٹوں والی آنکھوں سے مُجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بندروں سے نظر ہٹا کر جیسے ہی میں نے سامنے کی طرف دیکھا، اچانک گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

دو خوفناک صورت انسان جو ہتھیاروں سے لیس تھے ہمیں غور سے دیکھ رہے تھے۔

بندر کو سینے سے ہٹا کر میں نے آواز دے کر جان اور جیک کو جگایا۔ وہ دونوں گھبرا کر آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے اور اجنبیوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے، جان نے لپک اپنے بستر کے نیچے سے بندوق نکالنی چاہی مگر فوراً ہی اُس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا، بندوق وہاں نہیں تھی، ہم نے جلدی جلدی اپنے ہتھیار ٹٹولے مگر اُن دونوں بھیانک شکل کے آدمیوں کو طنزاً مُسکراتے دیکھ کر سمجھ گئے کہ تمام ہتھیار ان کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔

"کون ہو تم؟" جان نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا: "آخر اس بد تمیزی کا کیا مطلب ہے؟"

"زبان سنبھال کر بوڑھے آدمی۔" اُن میں سے ایک نے جس کی مونچھیں

کانوں کو چھو رہی تھیں کہا:

"بدتمیز کہنے والے کو ہم اُس کی بدتمیزی کا مزا چکھانا اچھّی طرح جانتے ہیں۔"

"کھڑے ہو جاؤ تم چاروں۔" دوسرے نے جس کے مُونہہ پر برص کے سفید داغ تھے اپنی بندوق ہماری سمت کرتے ہوئے کہا۔

"میں پوچھتا ہوں کہ آخر تم ہو کون؟" اس بار جیک نے غصّیلی آواز میں کہا۔

"ہم تمہارے آقا ہیں اور تُم ہمارے غلام، سمجھ گئے؟"

"کیا بکواس کرتے ہو۔" جان چلّایا: "ہمارے ہتھیار واپس کرو۔"

"دیکھو بڑے میاں۔" دوسرے شخص نے کہا۔

”زیادہ اکڑفوں مت دکھاؤ، تمہارے ہتھیار کھانے، پینے کا سامان کارتوسوں کی پیٹیاں اور خچر سب ہمارے قبضے میں ہیں، ہمیں چار غلاموں کی ضرورت ہے جو ہمارے ساتھ یہاں سے بیس میل مشرق کی طرف سامان اٹھا کر چلیں، اگر مگر کی ضرورت نہیں، آفت سنگھ جو چاہتا ہے حاصل کرلیتا ہے، اور اس کے معاملات میں کوئی دوسرا دخل نہیں دے سکتا۔“

یہ سُن کر جان نے جیک کو اور پھر جیک نے مُجھے دیکھا، درحقیقت یہ معمّہ ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا، ویسے مُجھے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ یہ دونوں ڈاکو ہیں مگر ڈاکوؤں کا کام تو صرف لوٹ مار کرنا ہے، ان دونوں نے ہمارا سامان لوٹ لیا ہے، پھر اب انہیں اور کیا چاہیئے؟ یہ ہمیں بیس میل مشرق کی طرف کیوں لے کر چلنا چاہتے ہیں؟

"دیکھئے آپ لوگ خواہ کوئی ہوں، مگر میں چاہتا ہوں کہ آرام سے بیٹھ کر ہمیں بتائیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں، اور ہمارے سامان پر قبضہ کرنے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟" جان نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر ذرا ادب سے کہا۔

"تمہیں بحث کرنے کی بہت بُری عادت ہے۔" پہلے ڈاکو نے کہا:

"اگر تم معلوم کرنا ہی چاہتے ہو تو سنو، ہمیں چار ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو ہمارا سامان، کیوں کہ تمہارا یہ سامان اب ہمارا ہی ہے، اٹھا کر ہمارے ساتھ بیس میل آگے پمّاکوٹی پہاڑ تک چلیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہم تمہیں ذرا بھی تکلیف نہیں پہنچائیں گے، بلکہ اُلٹا تمہیں مالامال کر دیں گے۔"

"تمہارا اسلحہ ہمارے پاس رہے گا۔" دوسرے ڈاکو نے کہا۔

”اور یہ تمہیں اس وقت واپس ملے گا جب کہ ہم اپنا کام پورا کرنے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔“

”اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو؟“ جان نے پوچھا۔

”تو پھر تمہیں گولی ماردی جائے گی اور تمہاری لاشیں گدھوں اور کوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ہم خود آگے چل پڑیں گے۔“

کُبڑا اتنی دیر میں بیدار ہو چکا تھا، اور وہ خاموشی سے اُن ڈاکوؤں کی باتیں سُن رہا تھا، اپنی جگہ سے کھسک کر وہ جان کے پاس آیا اور سرگوشی سے کہنے لگا:

”فی الحال اِن کی باتیں ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، مسٹر جان! ہمیں اِن سے نپٹنے کے لیے وقت چاہیئے، اور وہ اسی طرح مل سکتا ہے،

کہ ہم ان کا اعتماد حاصل کرلیں اور ان کے ساتھ تھوڑی دور تک ضرور چلیں۔"

"میرے خیال میں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جان نے اتنا کہہ کر اُس کی یہ بات مُجھے اور جیک کو سُنا دی، ہم نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور پھر جان نے ان سے کہا۔

"ٹھیک ہے، حالانکہ ہم کسی اور کام سے شمالی ہند جانا چاہتے تھے مگر اب نہیں جائیں گے، ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔"

"جھوٹ مت بولو۔" برص کے داغ والے ڈاکو نے کہا:

"ہمیں معلوم ہے کہ تم شمالی ہند نہیں جاؤ گے بلکہ وہاں سے آئے ہو، تم کسی خزانے کے چکّر میں ہو، جس کا نقشہ تمہارے اس لڑکے کی کمر پر بنا ہوا

ہے، یہ لڑکا کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا تب ہی ہم نے اس کی ننگی کمر پر یہ نقشہ بنا ہوا دیکھا ہے، سچ بتاؤ کہ یہ نقشہ کہاں کا ہے؟"

"یہ نقشہ اسی علاقے کا ہے۔" جان نے کُچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا :

"لیکن ہزار کوشش کے باوجود بھی خزانہ ہمیں نہیں مل سکا۔"

"یہاں تم سچ بول رہے ہو۔" اُسی ڈاکو نے کہا :

"کیوں کہ اگر تمہیں خزانہ مل گیا ہوتا تو وہ تمہارے سامان میں ہوتا، پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو خزانہ مل جاتا ہے ان کے چہرے خوشی سے دمکتے رہتے ہیں، اور تمہارے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی ہے، کوئی بات نہیں، تمہارا اور ہمارا راستہ ایک ہی ہے، کیوں کہ جس خزانے کا نقشہ اس لڑکے کی کمر پر بنا ہوا ہے، ہم اسی جیسے ایک خزانے کو تلاش کرنے

نکلے ہیں۔"

"یعنی۔۔۔۔۔"

"یعنی یہ کہ ہم بھی پمّا کوٹی پہاڑ میں ایک چھُپے ہوئے دفینے کو حاصل کرنے آئے ہیں، جب وہ مل جائے گا تو بعد میں تمہارا خزانہ تلاش کرنے میں تمہاری مدد کریں گے۔ ٹھیک ہے نا، ویسے تمہارے اور ہمارے نقشے میں تھوڑا سا ہی فرق ہے اور وہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ خبیث بُری طرح ہنسنے لگا، اِدھر میں سوچنے لگا کہ اس شخص کی نیّت میں ضرور کھوٹ ہے، پہلے وہ اپنے خزانہ کو تلاش کرے گا اور اگر اسے وہ مل گیا تو پھر ہمارا خزانہ حاصل کرنے کی بھی کوشش کرے گا، لالچی انسان کا لالچ کبھی ختم نہیں ہوتا، وہ تو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ویسے یہ بات ہمارے لئے قابل اطمینان تھی کہ وہ اپنے نقشے کو ہمارے نقشہ جیسا

سمجھ رہا تھا۔ بہر حال جان نے یہ کہا کہ اس وقت ان کی باتیں ماننی بہت ضروری ہیں، اگر ایسا نہ ہوا تو جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ہمارے ہتھیار ان کے قبضے میں تھے، اور ہتھیار کے بغیر ہم کسی سے لڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، پہلے میں نے اپنی کمر ان سے چھپائی تھی مگر اب جب کہ یہ راز ظاہر ہو چکا تھا کہ میری کمر پر خزانے کا نقشہ بنا ہوا ہے، تو پھر اس راز کو چھپانا بیکار تھا۔

"بہتر یہ ہو گا کہ تم لوگ خود ہی کام میں لگ جاؤ۔" برص کے داغ والے ڈاکو نے جو اپنا نام آفت سنگھ بتا چکا تھا کہا:

"میں اپنا نام تو تمہیں بتا ہی چکا ہوں، میرے ساتھی کا نام بھیروں ہے، یہ کم بخت مُجھ سے زیادہ خطرناک ہے، لہٰذا خیال رہے کہ ہم سے غدّاری کرنے کا کبھی مت سوچنا۔ غدّاری کی سزا ہر جگہ موت ہوتی ہے اور وہ

ہمارے اختیّار میں ہے۔"

"بے فکر رہیے، ہم آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے، مگر آپ اپنا کام ہو جانے کے بعد ہمیں آزاد کر دیں گے نا؟" جان نے بڑی نرمی اور ملائمت کے ساتھ کہا۔

"بالکل کر دیں گے۔" بھیروں نے کہا۔ "ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں، ہمیں تو اپنا خزانہ تلاش کرنا ہے، جب وہ مل جائے گا تو تم لوگ آزاد ہو گے، جہاں چاہو گے جا سکو گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ بس باتیں بہت ہو چکیں اپنے کُبڑے ساتھی سے کہو کہ وہ ہمارے لئے ناشتہ بنا کر لائے۔"

تفصیل میں نہ جاتے ہوئے بس مُجھے اتنا کہنا ہے کہ ان دو ظالم اور بدمعاش آدمیوں نے ہمیں چوبیس گھنٹے تک اتنا پریشان کیا اور ہم سے اتنا کام لیا کہ شاید گدھے بھی ہماری حالت کو دیکھ کر آنسو بہانے لگتے، یوں سمجھئے کہ خچّر

میں اور ہم میں کوئی فرق نہ تھا۔ ہمارے جسم ننگے تھے، پتلونیں پھٹ چکی تھیں، قمیصیں تار تار تھیں۔ اوپر سے جنوب کی گرمی، میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بعض دفعہ تو ہم نے کام کرنے سے بہتر مرنے کو ترجیح دی۔ شاید یہاں آپ کے دِل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ہم تو بہت بہادر اور نڈر انسان تھے، پھر آخر ہم نے دو خوفناک آدمیوں کی غلامی کو کیوں پسند کر لیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم چاہتے تو کسی بھی وقت چُپکے سے بھاگ سکتے تھے، مگر ایک تو رات کے وقت بھیروں جاگتا رہتا تھا، دوسرے سامان واپس لیے بغیر ہم بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور پھر سفر تو صحیح معنوں میں شروع بھی نہ ہوا تھا۔ ہمیں تو ہندوستان سے بہت دور جانا تھا، لہٰذا ہماری یہی کوشش تھی کہ موقع ملتے ہی ان دونوں پر قابو پالیں اور پھر پالام کوٹہ کے مقام پر واپس جائیں۔

ہمیں پیدل چلتے ہوئے دو دِن ہو گئے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اچانک بھیگی ہوئی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر ان ہواؤں میں اتنی تیزی پیدا ہو گئی کہ زمین پر قدم جمانے دشوار ہو گئے، جان نے آسمان کی طرف دیکھ کر بھیروں سے کہا۔

"سب سامان ایک جگہ باندھ دیجئے اور ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ جائیے، جلدی کیجئے۔"

"کیوں کیا ہوا، کیا بات ہے؟" بھیروں نے گھبرا کر پوچھا۔

"سائیکلون آنے والا ہے۔"

"سائیکلون!" بھیروں اور آفت سنگھ نے ایک ساتھ چلّا کر کہا اور پھر دوڑ کر سامان اُٹھانے لگے۔

سائیکلون کے بارے میں سُن کر تو میرے بھی ہوش اُڑ گئے۔ یہ دراصل سمندری بگولہ ہوتا ہے جو 100 سے لے کر ڈیڑھ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھومتا ہوا آبادی کی طرف بڑھتا ہے، اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ جو چیز بھی اس کی زد میں آجائے، نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی انسان اس بگولے میں پھنس جائے تو اس کا پھر خُدا ہی حافظ ہے، اوّل تو وہ اپنی جگہ پر ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا ہے تو کہیں بہت دور مُردہ حالت میں!

ہوا بڑھتی ہی جا رہی تھی اور پھر اس ہوا نے ہمیں اپنی جگہ سے دھکیلنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی اَن دیکھی طاقت ہمیں اس مقام سے آگے پھینک رہی ہو، جلد ہی ہم اس بھنور کی لپیٹ میں آ گئے، مُجھے یوں لگا کہ جیسے میرے جسم کی رگیں کھنچ رہی ہوں، آنکھوں میں سمندر کے کھاری پانی کے بخارات سے جلن پیدا ہو گئی تھی، حقیقت یہ ہے کہ چند لمحوں کے

اندر ہی ہم نیم مردہ ہو گئے تھے۔ سائیکلون ختم ہونے کے بعد ہماری حالت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم انسان ہیں، ہم مٹّی اور کیچڑ سے لت پت تھے، ہوا کے تھپیڑے سہتے سہتے ہمارے جسم سوج گئے تھے۔ پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل رہی تھیں اور جسم سے خون رِس رہا تھا، بھیروں آنکھیں پونچھتا ہوا سب سے پہلے اٹھا اور بُری طرح چیخنے لگا، ہم نے دیکھا کہ ہمارا ایک خچّر درخت سے ٹکرا کر مر چکا ہے۔ سامان چونکہ ہم نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ لہذا وہ محفوظ تھا، آفت سنگھ نے اُٹھتے ہی سب سے پہلے اسلحہ پر قبضہ کیا اور پھر ایک بندوق اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ایک زرد ہاتھ نے آگے بڑھ کر وہ بندوق تھام لی، سب نے گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ زرد ہاتھ اصل میں میری ہی جتنی عمر کے ایک چینی یا برمی نسل کے لڑکے کا تھا، جو بندوق اٹھا لینے کے بعد ہمیں مُسکرا کر دیکھ

رہا تھا۔ اس نے خلاف توقع ہمیں جھک کر انگریزی میں سلام کیا اور بولا۔

"اب کیسے ہیں آپ لوگ، ایسا لگتا ہے کہ اس قسم کے طوفانوں کا آپ کو کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو، یہی بات ہے۔" جان نے جواب دیا: "مگر تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔"

"تم چُپ رہو۔" بھیروں نے جان کو ڈانٹا: "سوالات صرف ہم کریں گے، تمھیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

لڑکے نے بڑے تعجّب سے بھیروں کو دیکھا اور ہماری بے بسی دیکھ کر سمجھ گیا کہ دال میں ضرور کُچھ کالا ہے، میں نے دیکھا کہ وہ لڑکا تقریباً ننگا تھا، البتّہ اس نے ایک پھٹی پرانی پتلون ضرور پہن رکھی تھی، اس کا ہتھیار

صرف ایک معمولی سا مگر مضبوط بانس تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا اور جس کی لمبائی لڑکے کے قد سے دوگنی تھی۔ لڑکا پھر مُسکرایا۔

"ایسا لگتا ہے کہ آپ پمّا کوٹی پہاڑ والا خزانہ تلاش کرنے آئے ہیں"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" آفت سنگھ نے بے اختیّار بندوق کا رخ اس کی طرف کردیا۔

"اس مقام پر وہی لوگ آتے ہیں جنہیں پمّا کوٹی تک جانا ہوتا ہے، اور پمّا کوٹی تک وہی لوگ جاتے ہیں جو شہنشاہ چی ای تھاؤ کا دفینہ تلاش کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن یہاں بڑے بڑے آئے اور جھک مار کر چلے گئے، آپ سے کُچھ بھی نہ ہوگا۔"

"بدتمیز، تو بہت کُچھ جانتا ہے، اب تیری خیر نہیں۔ سچ بتا کیا تو نے دفینہ

نکال لیا ہے؟"

"کہاں نکالا؟" لڑکا پھر ہنسا: "مُجھ جیسا کمزور لڑکا بھلا اتنا بڑا کام کیسے کر سکتا ہے؟ اب آپ چھ آدمی آئے ہیں، میں کھدائی کا کام آپ کے سپرد کر دوں گا، خزانہ ملنے کے بعد اسے نکال کر واپس چلا جاؤں گا، اور آپ کی چھٹی کر دوں گا۔"

آفت سنگھ اور بھیروں کو تو حیرت تھی ہی مگر مُجھے بھی کُچھ کم تعجّب نہ تھا، تھا تو وہ ایک معمولی سا لڑکا، مگر دعوے بہت بڑے کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا ہم اس کے خادم ہوں، اور وہ ہمیں کھدائی کرانے کے لئے ہی ساتھ لایا ہو۔ ہم میں سے تو کوئی نہ بولا، البتّہ بھیروں تڑپ کر کھڑا ہو گیا، اور لڑکے کی طرف دو قدم بڑھتے ہوئے بولا۔

"ایسا لگتا ہے تُجھے اپنی زندگی پیاری نہیں جو تو اس قسم کی بکواس کر رہا

ہے۔"

"میرے خیال میں اسے مار ڈالو بھیروں۔" آفت سنگھ نے کہا:

"یہ لڑکا خطرناک معلوم ہوتا ہے، ہمارے کام میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑائے گا۔"

چینی لڑکا گو اُن کی باتیں نہ سمجھ سکا مگر ان کے لب و لہجہ، ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ، آنکھوں کی مکّاری اور اُن کے لالچی دماغ کو اچھّی طرح جان گیا، میرے خیال میں اس نے محسوس کر لیا کہ صرف وہی دو اچھّے آدمی نہیں ہیں، اس نے حقارت سے بھیروں اور آفت سنگھ کو دیکھا اور پھر یکایک غصّے میں آ کر بولا۔

"سنو، مُجھے کوئی معمولی لڑکا نہ سمجھو، میں بہت بڑی طاقت کا مالک ہوں۔

اگرچہ دیکھنے میں تمھیں کمزور دکھائی دیتا ہوں، میں تمہاری زبان نہیں سمجھتا مگر تمہاری آنکھوں کی بے رحمی نے مُجھے بتا دیا ہے کہ تم کون ہو، یاد رکھو، میری ہستی بہت بڑی ہے، مُجھ سے گفتگو کرنے میں تمیز سے کام لینا، ورنہ نتیجہ کے ذمہ دار تم خود ہوں گے۔"

"کیا بکتے ہو؟" بھیرو نے ٹریگر پر انگلی رکھ لی: "کیا تمھیں اپنی جان کا خوف نہیں۔"

"ایسا لگتا ہے کہ تمھیں بھی اپنی جان پیاری نہیں ہے۔" چینی لڑکے نے کہا: "بندوق رکھ دو اور غور سے سنو۔"

ہماری پارٹی حیرت اور توجّہ کے ساتھ اُن کی یہ باتیں سُن رہی تھی، سچ بات تو یہ ہے کہ ہم آفت سنگھ اور بھیروں کی غلامی کا چولا فوراً اتار دینا چاہتے تھے، کیوں کہ ہمارا وقت بہت ضائع ہو چکا تھا، مگر مُصیبت یہ تھی کہ وہ

مکّار ڈاکو ہماری اتنی زبردست نگرانی کرتے رہے تھے کہ ہمیں بھاگنے کا ذرا سا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ چلتے وقت ہمیں سب سے آگے رکھتے تھے، ہمارے سروں پر اُن کا سامان لدا ہوا ہوتا تھا اور دونوں ہاتھوں سے ہم نے وہ سامان پکڑ رکھا ہوتا تھا۔ ہمارے پیچھے بندوق کی نالیں ہمیں دیکھتی رہتی تھیں۔ ان حالات میں ہمیں فرار کا ذرا سا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ مگر اب کُچھ اُمّید ہوئی تھی کہ اگر کسی طرح ان تینوں میں ٹھن جائے تو شاید ہمیں بھاگنے کا موقع مل سکے گا۔ ویسے میں نے اور جان نے یہ پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ موقع ملتے ہی اسے ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے گا اور ان ڈاکوؤں کے چنگل سے نکلنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ چینی لڑکا کُچھ بول رہا تھا، لہٰذا میں نے توجّہ سے سُننا شروع کیا۔

"مُجھے معمولی لڑکا مت سمجھو، میں شہنشاہ چی ای تھاؤ کی ساٹھویں نسل سے

ہوں۔ چند ماہ پہلے ہی مُجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے جدِّ امجد کا بہت بڑا خزانہ اِس مقام پر دفن ہے، شہنشاہ کو جلاوطن کر دیا گیا تھا، اور وہ پہلے سنگاپور آئے تھے اور پھر وہاں سے پمّا کوٹی نامی اِس ضلع میں جس کے اُونچے پہاڑ کو بھی اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ میں نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں بہت دولت دیکھی ہے، مُجھے دولت کی ہوس نہیں ہے لیکن ہاں ایک خاص کام کے لئے اب مُجھے اس کی ضرورت ہے اور میں تمہیں بتا دوں کہ میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔"

"تُجھ جیسا بے وقوف لڑکا، میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" آفت سنگھ نے اکڑ کر کہا: "تُو تو اس طرح بات کر رہا ہے جیسے ہم سے زیادہ طاقتور ہو؟"

"بے شک، میں تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ لو میں تمہیں ابھی اپنی طاقت دکھاتا ہوں، ہوانگ ہو کی طاقت۔"

لڑکے کے مُنہ سے سن کر پہلی بار معلوم ہوا کہ اس کا نام ہوانگ ہو ہے۔

بہرحال حالات دِل چسپ ہوتے جا رہے تھے۔ ہمیں علم تھا کہ لڑکا یہ جان چکا ہے کہ ہم مظلوم ہیں اور ان ڈاکوؤں کے پھندے میں گرفتار ہیں۔ یہ ہمارے لیے کافی تھا، ہم نے دیکھا کہ لڑکے نے اچانک ایک بھاگتے ہوئے سؤر کو پکڑلیا، اور پھر چند سیکنڈ میں ہی اُس کی ٹانگیں باندھ کر اُسے بے بس کر دیا۔ بھیروں اور آفت سنگھ غور سے اس کی حرکتیں دیکھ رہے تھے۔ لڑکے نے اس کے بعد اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑی سیپ نکالی جو دونوں طرف سے بند تھی۔ اس نے سیپ کا ڈھکنا کھول کر اس کا کنارہ اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلی سے لگا دیا۔ فوراً ہی ایک بہت بڑی کالی مکڑی سیپ میں سے نکل کر ہوانگ ہو کی ہتھیلی پر رینگنے لگی۔

"تم جانتے ہو اِسے؟ یہ کون سی مکڑی ہے؟" لڑکے نے پوچھا۔

"کیا مداریوں کے سے کرتب دکھا رہا ہے احمق؟" بھیروں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: "خیر میں نہیں جانتا۔"

"میں جانتا ہوں یہ کون سی مکڑی ہے۔" جان نے فوراً جواب دیا۔

"اچھّا آپ جانتے ہیں۔" ہوانگ ہو نے جان کو آپ سے مخاطب کرتے ہوئے تعجّب سے کہا: "اچھّا تو بتائیے۔"

"یہ مکڑی جنوبی امریکہ میں پائی جاتی ہے، اس کا نام ٹویڈا ہے، اس سے زیادہ زہریلا جانور دُنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔"

"بہت خوب بہت خوب۔" لڑکا یہ سُنتے ہی اُچھل پڑا۔ "آپ تو واقعی بڑے قابل ہیں۔ جہاں تک میرا یقین ہے آپ ان دونوں کے ساتھی نہیں ہیں، آپ چاروں کو شاید اِن ڈاکوؤں نے زبردستی اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔"

جان نے کوئی جواب نہ دیا، بھیروں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے گردن جھکالی۔

"ضرور یہی بات ہے۔" لڑکے نے کہا۔ "کہاں یہ خوفناک صورتیں اور کہاں آپ چاروں، خیر کوئی بات نہیں، وقت آنے پر آپ ضرور آزاد ہو جائیں گے، اچھّا تو بھیروں، باتیں تو بہت ہو گئیں، لو اب میں تمہیں اپنی طاقت دکھاتا ہوں۔"

دونوں ڈاکو لگاتار ہنستے رہے، اُن کے خیال میں لڑکا ایک معمولی سا اور بے ضرر انسان تھا۔ جس کو وہ جب چاہتے مسل کر رکھ دیتے۔ اسی لئے وہ اس کو طرح دے رہے تھے اور ہنس ہنس کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے، ہوانگ ہو نے جھُک کر اپنی ہتھیلی زمین سے لگا دی اور دوسرے ہاتھ کی انگلی سے مکڑی کو کُچھ اشارہ کیا۔ مکڑی چند انچ تو زمیں پر چلی، اس کے بعد وہ اچانک

پھُدکی اور ایک تار بناتی ہوئی سؤر کے جسم پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے صاف دیکھا کہ اس نے اپنا ڈنک سؤر کے جسم میں چبھو دیا اور یہ کام انجام دینے کے بعد وہ دوبارہ پھُدک کر سؤر کے جسم سے لڑکے کے شانے پر آ کر بیٹھ گئی۔ پہلے تو بھیروں کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا، مگر جب اُس نے سؤر کو ایڑیاں رگڑتے دیکھا تو گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور اس وقت تو خوف کے مارے اس کی چیخ نکل گئی جب اس نے دیکھا کہ سؤر کا جسم یوں گھُل رہا ہے جیسے برف گھُلتی ہے۔

"دیکھا یہ میرا ہتھیار ہے، یعنی میری پالتو مکڑی، جو کوئی مُجھے نقصان پہنچانا چاہے گا اس کا یہی حشر ہو گا جو سؤر کا ہوا ہے۔" لڑکے نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو بہت زہریلی ہے۔" آفت سنگھ کا چہرہ خوف کے مارے زرد

ہوگیا۔

"اس کے علاوہ یہ میری محافظ بھی ہے، اگر کسی نے مُجھے مار بھی ڈالا تب بھی یہ مکڑی قاتل کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اب ایک تماشا اور دیکھو۔" ہوانگ ہونے یہ کہہ کر اپنی مکڑی کو زمین پر رکھ دیا۔ کُچھ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر بھیروں سے بولا۔

"تم چاہو تو اِس پر گولی چلا کر یا خنجر سے وار کر کے اِسے مار سکتے ہو، جاؤ تمہیں اجازت دی۔"

بھیروں بڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا، لڑکا مُسکراتا رہا اور اب اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ بھیروں کے ہاتھ میں بندوق تو تھی ہی مگر اس میں تو صرف ایک کارتوس آتا ہے۔ لہٰذا اُس نے بندوق رکھ کر پستول نکال لیا اور لڑکے کے بار بار اُکسانے پر اُس نے لگاتار چھ فائر مکڑی پر کر ڈالے مگر پھر یہ

دیکھ کر اس کی جان نکل گئی کہ مکڑی ہر فائر پر پھُدک کر جگہ بدل دیتی تھی، آخری فائر کے بعد وہ پھُدک کر بھیروں کے کندھے پر ہی آ بیٹھی۔

بس اُس وقت اس کی حالت دیکھنے کے لائق تھی، یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے قدم زمین میں گاڑ دیے ہیں۔ وہ بالکل ساکت ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا خُون کسی نے نچوڑ لیا ہو، وہ ڈر کے مارے ہِل بھی نہیں رہا تھا، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مکڑی ہلتے ہی ڈنک مار دے!

"بولو۔۔۔ اب کیا کہتے ہو، میرے اشارے پر یہ مکڑی تمہارے ڈنک مار سکتی ہے، اس کی چالاکی بھی تم نے دیکھ لی کہ یہ کتنی پھرتیلی ہے، تمہارے چھ کارتوس بے کار گئے۔" چینی لڑکے نے اُن دونوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ بھیروں تو جیسے گونگا بن گیا تھا۔ اس چھوٹے سے چینی لڑکے کی غیر معمولی طاقت کا اندازہ اسے اب ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کسی

معمولی آدمی سے اس کی ٹکّر نہیں ہے بلکہ ہوانگ ہو سے مقابلہ کرنا لوہے کے چنے چبانے جیسا ہے، اِدھر میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اگر یہ لڑکا بھی ہماری پارٹی میں شامل ہو جائے تو کتنا اچھّا رہے گا۔ ممکن ہے اس کی پالتو مکڑی ہمیں کبھی کوئی کام دے جائے، میں نے جب جان سے یہ مشورہ کیا تو وہ بولا۔

"خاموش رہو، اور ان کے کسی معاملے میں دخل مت دو۔"

"دفینہ مل جانے کے بعد میں تمہیں صرف چوتھائی حصّہ دوں گا۔" ہوانگ ہو نے بھیروں سے کہا: "بولو، کیا تمہیں یہ سودا منظور ہے؟"

بھیروں سر جھکا کر کُچھ دیر سوچتا رہا، آخر بولا: "ہاں مُجھے منظور ہے۔"

"اور اگلا چوتھائی ان لوگوں کو جنہیں تم نے گرفتار کر رکھا ہے۔"

"مُجھے یہ بھی منظور ہے۔" بھیروں نے آہستہ سے کہا مگر اچانک یہ بات سن کر جان نے جلدی سے کہا۔

"نہیں، نہیں، ہمیں کوئی خزانہ نہیں چاہیئے۔"

"تم نے دیکھا ان شریف لوگوں نے کیا کہا؟"

ہوانگ ہو نے تعریفی نظروں سے جان کو دیکھتے ہوئے کہا: "جن لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ خزانے اور دفینے کتنی مُصیبت اور پریشانی لاتے ہیں وہ انہیں پسند نہیں کرتے، خیر یہ تو میری مرضی ہے کہ میں کس کو کیا دوں، میں چاہوں تو اکیلا ہی اس خزانے تک پہنچ سکتا ہوں، مُجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کس جگہ دبا ہوا ہے، میری مکڑی مُجھے اُس مقام کا پتہ بتا دے گی، میں تُم سے وہ جگہ کھُدواؤں گا جو کنوئیں جیسی ہے، جنوبی ہند کے اِن مقامی لوگوں کی زبان میں پمّا کنوئیں کو اور کوٹی پہاڑ کو کہتے ہیں۔ وہ پہاڑ ایک

کنوئیں جیسا ہے۔ تم دیکھ ہی لو گے۔ اب مُجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ شہنشاہ چی ای تھاؤ نے اتنی دور آ کر اپنا خزانہ پمّاکوٹی پر کیوں دبایا؟"

"نہیں۔۔ ہمیں نہیں معلوم۔" آفت سنگھ اور بھیروں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"شہنشاہ چی ای تھاؤ جب معمولی آدمی تھا تو اس نے مہاتما بدھ کو ماننا چھوڑ دیا۔ اتّفاق سے اُسی زمانے میں اُسے عروج ہوا اور وہ بادشاہ بن گیا۔ وہ یہ سمجھا کہ بھگوان کوئی چیز نہیں، خُدا کا کوئی وجود نہیں جو کُچھ بھی ہوں میں ہوں، یہ تمام دولت میں نے اپنے ہی بل بوتے پر حاصل کی ہے۔ بس اس کا یہ سوچنا تھا کہ اسی دِن اس کا زوال شروع ہو گیا، اسے کسی نے چین میں رہنے نہیں دیا۔ بغاوت ہو گئی اور وہ بھاگ کر یہاں آ گیا۔ اس نے ایک عقل مندی یہ کی کہ جس جگہ بھی گیا اپنی نشانیاں چھوڑتا گیا، جب وہ مر گیا تو

اس کی انھیں نشانیوں سے اس کے وارثوں کو اس کا پتہ چلا۔ میں اس کا
جائز وارث ہوں، اور مُجھے یہ معلوم ہے کہ اس نے اپنا خزانہ پپّا کوٹی کی چوٹی
پر دبا دیا تھا۔ بس میں وہ خزانہ لینے آیا ہوں اور جیسا کہ میں نے تم سے کہا
ہے کہ تم خزانہ کھودنے میں میری مدد کرو گے۔ بولو منظور ہے؟"

"منظور ہے، مُجھے ہر بات منظور ہے۔" بھیروں گڑگڑا کر بولا: "مگر۔۔۔
مگر بھگوان کے لئے اس مکڑی کو تو ہٹاؤ۔"

ہوانگ ہو نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مکڑی بھیروں کے شانے پر سے کود کر
اس کی ہتھیلی پر جا بیٹھی۔ یہ بڑا عجیب و غریب لڑکا تھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ
تقریباً میری ہی عُمر کا تھا۔ مگر میں اُس سے ڈرنے لگا، مُجھے اس کی مکڑی
سے بھی خوف محسوس ہونے لگا تھا، بعد میں جان ہم سے مشورہ کرنے لگا۔
اس کا خیال تھا کہ ہمیں لڑکے کا ساتھ تو دینا چاہیئے مگر خزانے کے سلسلے

میں کوئی لالچ نہیں ظاہر کرنا چاہیئے، اگر خزانے کا ایک چوتھائی حصّہ ہمیں مل گیا تو اسے ہم قبول کرلیں گے، اگر نہیں ملا تو ہم اصرار بھی نہیں کریں گے، کیوں کہ ایک بے حد قیمتی اور نایاب خزانے کو ہم پچھلے کھنڈرات میں چھوڑ آئے ہیں، وہ خزانہ ہوانگ ہو والے خزانے سے بہت بڑا ہے، اور ہمارے لیے وہی کافی ہے۔

وہ رات اسی مقام پر بسر ہوئی اور ہوانگ ہو کی مکڑی رات بھر اس کا پہرہ دیتی رہی، اور صُبح کے وقت اس نے مکڑی کو دوبارہ سیپ میں بند کرلیا۔ سچ تو یہ ہے کہ بھیروں اور آفت سنگھ اتنے خوفزدہ تھے کہ انہوں نے بھاگنے یا لڑکے کو مارڈالنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی، سورج ابھی پوری طرح نکلا بھی نہیں تھا کہ ہمارا قافلہ سب ساز و سامان کے ساتھ پمّا کوٹی کی طرف روانہ ہوگیا، ہم دیکھ بھال کر آگے قدم بڑھانے لگے، جنگل میں

ایک عجیب قسم کی بُو پھیلی ہوئی تھی، اور چاروں سمت ایک پُراسرار اور گہرا سنّاٹا حاوی تھا، دل خواہ مخواہ تیزی سے سینوں میں دھڑک رہے تھے، ہم جتنا آگے بڑھتے، جھاڑیاں گھنی ہوتی جاتیں اور گنجان جنگل کو دیکھ کر سب کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ صرف ہوانگ ہو ہی تھا جو بڑی ہمّت اور ہوشیاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ رہے ہم تو ہم تو اس وقت ان تینوں کے رحم و کرم پر تھے، جو وہ چاہتے وہی ہو رہا تھا، جان کا مشورہ تھا کہ ہمیں بھاگنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے، کیونکہ اس کے خیال میں یہی ہمارے حق میں بہتر تھا۔

چار گھنٹے کے بعد ہم پمّا کوٹی کے دامن میں کھڑے تھے، یہ پہاڑ بالکل سیدھا تھا، ہوانگ ہو کے حکم پر آفت سنگھ نے اس پر چڑھنے کی بار بار کوشش کی مگر ہر مرتبہ پھسل کر نیچے آ رہا۔ آخر جان کے کہنے پر میں نے اُسے

مضبوط رسّی سامان میں سے نکال کر دی، رسّی کی مدد سے جیک چند ہی منٹ میں اوپر پہنچ گیا اور پھر ایک ایک کر کے ہم رسّی کو پکڑ کر اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ پہاڑ کی چوٹی بہت خطرناک نظر آتی تھی، اس چوٹی پر صرف ایک درخت تھا بالکل سوکھا ہوا درخت جس کی ٹہنیاں یوں لگتی تھی جیسے موت کے لمبے لمبے ہاتھ ہوں جواب لپکے اور تب لپکے۔ درخت کے نیچے ایک انسانی ڈھانچہ پڑا ہوا تھا، اسے دیکھ کر یہ جگہ دوزخ کا ایک سُنسان کونہ دکھائی دیتی تھی۔ ہمارے دِل بُری طرح دھڑک رہے تھے، اور ہاتھ پیروں کا دم سا نکلا ہوا تھا۔ سب کے چہروں پر وحشت برس رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے ابھی کُچھ نہ کُچھ ہونے والا ہے۔

"یہی وہ جگہ ہے جہاں لازوال دولت کسی اجنبی مسافر کی برسوں سے راہ تک رہی ہے۔" ہوانگ ہو نے کہنا شروع کیا۔ "اِسی مقام پر کہیں نہ کہیں

بے شمار دولت دفن ہے، جو صرف قسمت والوں ہی کو ملا کرتی ہے، یا پھر ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے دِل صاف ہوتے ہیں، نیّت میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتا۔ یاد رکھو، یہ بہت مقدس جگہ ہے، شہنشاہ تھاؤ نے مرنے سے پہلے مہاتما بدھ سے توبہ کی تھی اور مرتے وقت اسے مہاتما کے درشن بھی ہوئے تھے، بس میں نے بہت باتیں کر لیں، اب فوراً دو کواپس لے کر تم دونوں کھدائی شروع کر دو۔"

آخری فقرے اس نے بھیروں اور آفت سنگھ کو مخاطب کر کے کہے، مرتے کیا نہ کرتے، دونوں نے کواپس زمین پر بجانی شروع کر دیں۔ خزانہ پانے کی خوشی میں دونوں کا خوف غائب ہو چکا تھا، اور بھیروں کی نگاہوں میں پھر پہلے جیسی شیطانی چمک پیدا ہو گئی تھی، آفت سنگھ کا تو بس نہ چلتا تھا، کہ ایک سیکنڈ میں گڑھے کی مٹّی اٹھا کر باہر پھینک دے۔ دونوں کے

جسم پسینے سے بھیگ چکے تھے۔ اور وہ برابر زمین کھودے جا رہے تھے، آدھ گھنٹے کی جاں توڑ محنت کے بعد آخر کار ایک ایسا صندوق نظر آیا جس پر چینی نقش و نگار بنے ہوئے تھے، اسے دیکھتے ہی ان تینوں میں یکایک زبردست جوش پیدا ہو گیا البتّہ جان اور جیک بالکل بے تعلّق خاموش کھڑے رہے، کُبڑے کی آنکھوں میں بھی حرص نظر آنے لگی، رہا میں تو میں آپ سے سچ کہتا ہوں مُجھے ایسے خزانوں سے ذرّہ برابر بھی دلچسپی نہیں تھی۔

بھیروں اور آفت سنگھ نے ہوانگ ہو سے کہا کہ وہ صندوق کا ڈھکنا خود اٹھائے اور دیکھے کہ اس میں کیا ہے۔ یہ سن کر لڑکا رسّی کی مدد سے سنبھل سنبھل کر گڑھے میں اترا۔ یہ گڑھا کھُد جانے کے بعد تقریباً پندرہ فٹ کا ہو گیا تھا، جب وہ نیچے پہنچا تو ہم نے بھی اس کنوئیں میں جھانکا۔ میں نے

دیکھا کہ ہوانگ ہو ڈھکنا اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے، بھیروں اور آفت سنگھ خاموش کھڑے تھے، اچانک میں نے دیکھا کہ بھیروں کا کدال والا ہاتھ اوپر اٹھ رہا تھا، ہوانگ ہو کو جھُکے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت پیدا ہو گئی اور پھر اس نے کدال پوری قوّت سے اٹھا کر لڑکے کی کمر میں پیوست کر دی، وہ ایک زبردست چیخ مار کر پیچھے کی طرف گِرا اور ایسا کرتے وقت صندوق کا ڈھکنا کھول گیا، ہم نے اوپر سے دیکھا کہ صندوق میں شہنشاہ چی ای تھاؤ کے بیش قیمت کپڑے نظر آ رہے تھے۔ بھیروں نے مرتے ہوئے لڑکے کی کوئی پرواہ نہ کی بلکہ دونوں ہاتھوں سے اس نے صندوق کا سامان باہر نکالنا شروع کر دیا۔ ہوانگ ہو اَدھ کھلی آنکھوں سے اس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا، خزانہ تو کیا صندوق میں سے ایک چھوٹا سا سِکّہ بھی برآمد نہیں ہوا۔ البتّہ چینی زبان میں لکھی ہوئی ایک کاغذ پر چند سطریں ضرور

نکلیں، بھیروں ڈاکو اپنی ناکامی سے پاگل ہوگیا تھا، اس نے مرتے ہوئے لڑکے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور بولا:

"او بے وقوف بتا یہ کیا لکھا ہے؟ بعد میں آسانی سے مر لیجیو۔"

ہوانگ ہو مُسکرایا، اُس نے وہ تحریر پڑھی اور اٹک اٹک کر جو کُچھ بتایا وہ میں نیچے لکھتا ہوں، اس نے کہا:

"یہی تو وہ دس خزانے ہیں جن کی ہر انسان کو تلاش رہتی ہے، سنو خزانے کا پہلا انمول موتی یہ ہے کہ ہمیشہ بزرگوں کا ادب کرو، دوسرا یہ کہ کسی کو حقیر نہ سمجھو، تیسرا یہ کہ کمزوروں کا خیال رکھو، اور ان پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ، چوتھا یہ کہ دولت سے دور رہو، یہ انسان کو اپنوں سے دور کر دیتی ہے، پھر پانچواں یہ کہ سب کے ساتھ بھلائی کرو، چھٹا یہ کہ مُصیبت میں خُدا کو یاد کرو۔ ساتواں یہ کہ عبادت کرو، یہ برائیوں سے دور رکھتی ہے۔ آٹھواں خزانہ یہ کہ

چھوٹوں سے محبّت کرو، نواں یہ کہ لالچ سے دِل نہ بھرو اور دسواں خزانہ یہ کہ اپنی موت کو ہمیشہ یاد رکھو۔"

ہوانگ ہو نے اتنا کہنے کے بعد بڑی مُشکل سے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی سیپ نکالی اور اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ ایسا کرتے ہی مکڑی تو آزاد ہو گئی مگر ہوانگ ہو ہمیشہ کے لیے موت کی قید میں جا بسا۔ مُجھے اِس چینی لڑکے پر ترس آ رہا تھا۔ اس غریب کو بھی کیا معلوم تھا کہ خزانہ دراصل دس انمول ہدایتیں ہوں گی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہدایات درحقیقت سمجھ دار انسان کے لیے خزانے سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ اچانک ایک بھیانک چیخ اس کنویں میں گونجی اور اِس چیخ کے بعد دوسری چیخ۔ ہم نے جلدی سے جھانک کر دیکھا تو بھیروں اور آفت سنگھ کے جسم پانی بن کر بہہ رہے تھے۔ مکڑی نے ہوانگ ہو کا انتقام لے لیا تھا۔

اور اب ہمارا بھی اس مقام پر کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہ تھا، لہٰذا ہم نیچے اترنے لگے، پپّا کوٹی پہاڑ سے اترنے کے بعد ہم واپس اسی مقام پر یعنی پالام کوٹہ گئے، جہاں پر بھیروں نے ہمیں گرفتار کیا تھا۔ جان نے یہ طے کیا کہ ہم ایک دِن وہاں گزاریں اور پھر اپنے اس سفر پر روانہ ہوں جس کے لئے ہم بمبئی سے روانہ ہوئے تھے۔

سفر۔۔۔۔ سفر۔۔۔۔۔ ہر وقت کا سفر!

۔۔۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اب اس سفر سے عاجز آ گیا تھا، میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی کا اپنی جان چھڑا کر بھاگ چکا ہوتا۔ مگر ایک تو نئے نئے واقعات میں حصّہ لینے کا شوق اور دوسرے میرا عہد۔ اس لیے میں مجبور تھا کہ سفر میں ساتھ رہوں۔ راستے میں کیا ہوا؟ رات بھر ہم کس طرح چلتے رہے، کیا کیا مشکلات پیش آئیں؟ میرے خیال میں مجُھے یہ سب آپ کو

بتانے ضرورت نہیں، کیوں کہ میں بے کار سی باتوں سے اپنی اس
داستان کو بلا وجہ لمبا نہیں کرنا چاہتا۔ بس مختصراً یوں سمجھ لیجئے، ہم رات
کے چار بجے کے قریب ماہی گیروں کی ایک بستی میں پہنچ گئے۔

یہ سب لوگ بالکل ننگ دھڑنگ تھے اور ان کا رنگ بھی بالکل کالا تھا،
زبان ایسی بولتے تھے جو کم از کم میرے لیے عجیب تھی۔ خُدا جانے ملیالم
تھی، تامل تھی یا کیا۔ بہرحال جان، جسے دعویٰ تھا کہ دُنیا کی بہت سی
زبانیں سمجھ سکتا ہے، اُس زبان کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ بستی والے پہلے تو
ہمیں پاگل سمجھ کر بھاگ گئے۔ مگر جب ہم نے اشاروں سے انہیں قریب
بلایا تو ڈرتے ڈرتے پاس آئے، ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہمیں ڈاکو سمجھ رہے
ہوں، کیوں کہ بندوق دیکھ کر ہر کوئی یہی سوچ سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ
بھیروں اور آفت سنگھ نے کبھی اِن لوگوں کو پریشان کیا ہو، اسی لیے وہ ہم

سے ڈر گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم نے انہیں سمجھایا کہ ہمیں کپڑے چاہئیں۔ ایک بوڑھا ماہی گیر ہمیں اپنے ساتھ لے کر بستی کے اندر گیا اور پھر ہمیں ایک جھونپڑی کے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

جھونپڑی کے اندر ایک بہت ہی بوڑھا شخص ناریل کی چٹائی پر بیٹھا ہوا تاڑی پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ پیشتر اس کے کہ ماہی گیر اس سے کُچھ کہتا، کُبڑے چیتن نے آگے بڑھ کر ایک عجیب زبان میں اُس سے باتیں شروع کر دیں۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی اور ساتھ ہی یہ تشویش بھی کہ خُدا جانے یہ کم بخت اس اجنبی سے کیا کہہ دے؟ بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ ہم ان لوگوں کی ایک بات نہ سمجھ سکتے تھے اور وہ آپس میں برابر باتیں کیے جا رہے تھے۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں کُبڑا انہیں اپنا ہمدرد نہ بنا لے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ کافی دیر تک باتیں

کرتے رہنے کے بعد بوڑھا ہم سے مخاطب ہوا، پہلے تو اُس نے ہم سب کو اوپر سے نیچے تک بڑے غور سے دیکھا، اور پھر جان سے انگریزی میں بولا۔

"آپ کا ساتھی کہہ رہا ہے کہ آپ کو سمندر میں کسی نا معلوم جزیرے پر جانا ہے اور اس کے لیے آپ کو کسی اسٹیمر یا کشتی کی ضرورت ہے؟"

بُوڑھے کی زبان سے انگریزی سُن کر ہم بہت خوش ہوئے اور ساتھ ہی یہ سوچ کر اطمینان بھی ہوا کہ کُبڑا ابھی تک ہمارا وفادار ہے کیوں کہ اگر وفادار نہ ہوتا تو ہمیں پھنسانے کا اس کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ جان نے آگے بڑھ کر کہا۔

"جی ہاں، ہمیں اسٹیمر یا کشتی کی سخت ضرورت ہے۔ کیا مل سکے گی؟"

"مل جائے گی، مگر سمندری پولیس آپ کو ضرور پریشان کرے گی۔۔۔"
بُوڑھے نے کہا۔

"آپ اس کی فکر مت کیجئے، پاسپورٹ کے علاوہ میرے پاس حکومت ہند
کا خاص اجازت نامہ بھی موجود ہے۔"

"بس تو پھر ایک تیز رفتار بادبانی جہاز چار ملّاحوں کے ساتھ آپ کو مل سکتا
ہے۔ یہ ہماری بستی کا جہاز ہے آپ کو ضرورت ہے تو آپ لے لیجئے اور
اس کی قیمت دے دیجئے۔"

مختصر یہ کہ سب باتیں مکمل طور پر طے ہو جانے پر وہ چھوٹا سا جہاز ہم نے
خرید لیا۔ پروگرام یہ تھا کہ ہم لوگ صُبح کو روانہ ہو جائیں گے۔ اب شام ہو
رہی تھی اس لیے اب ہم نے آرام کرنے کی ٹھانی، تاکہ صُبح کو سمندری
سفر کے لئے تازہ دم ہو جائیں۔ سب ضروری کام کرنے کے بعد جب

ہم آرام کرنے کے لیے لیٹے تو میں دِل ہی دِل میں کُبڑے کے بارے میں سوچتا رہا۔ مانا کہ اب وہ شریف بن گیا تھا اور اب ہمیں اس سے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا، لیکن جو شخص ایک بار اپنے بھیانک روپ میں میرے سامنے آچکا ہو، کیا پھر کبھی وہ دوبارہ ویسا ہی روپ اختیّار نہیں کر سکتا! میرا دِل بار بار گواہی دیتا تھا کہ یہ شخص ابھی تک خطرناک ہے اور ہمیں اس سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

اگلے دِن وہ ملّاح جو اب ہمارے ملازم تھے صُبح گیارہ بجے ہمارے پاس آ گئے اور ہم سے کہا کہ سفر شروع کرنے کے لئے وہ ہر وقت تیّار ہیں، اور ضرورت کا سب سامان جہاز پر لاد دیا گیا ہے، اس لئے بہتر ہو گا کہ سفر ابھی شروع کر دیا جائے۔ ہم تو تیّار تھے ہی اس لئے اپنا اپنا سامان اٹھا کر بستی سے باہر نکلے۔ اس وقت ہم پیدل ہی چل رہے تھے، کیوں کہ اپنے خچّر

ہم نے بستی کے بُوڑھے شخص کی امانت میں دے دیے تھے۔ ارادہ تھا کہ اگر زندہ رہے اور واپس آئے تو لے لیں گے۔ حالانکہ ہم نے اپنے سفر کا مقصد کسی کو بھی نہ بتایا تھا، پھر بھی لوگوں نے سمجھ لیا کہ ہم کسی خطرناک مہم پر جا رہے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں نے ہمیں جہاز پر بیٹھتے دیکھ کر زور زور سے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

جان نے کُبڑے سے پوچھا: "تمہیں تو معلوم ہو گا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جی ہاں معلوم ہے، مگر بتاتے ہوئے میرا دِل کانپتا ہے۔" کُبڑے نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

بادبان کے ستون سے سہارا لے کر وہ خاموش بیٹھ گیا اور ایک ہی سمت ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ میں یہ سوچ کر کہ اس طرح اگر میں خود بھی خاموش رہا

تو یقیناً پاگل ہو جاؤں گا۔ ملّاح سے اُس کا وہ مچھلیاں پکڑنے والا ہارپون لے کر جہاز کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا۔ ہارپون کے ساتھ ملّاح نے ایک رسّی بھی باندھ دی تھی تاکہ نیزہ سمندر میں پھینکنے کے بعد واپس کھینچا جا سکے۔ میں نے عقل مندی یہ کی کہ وہ رسّی اپنی کمر کے گرد باندھ لی۔ دِل میں یہ سوچا کہ بڑی مچھلی ہی کا شکار کروں گا۔ اگر مچھلی اتّفاق سے وزنی ہوئی اوراس نے رسّی کھینچنی چاہی تو ہاتھوں کے بجائے میں اپنے جسم کا زور لگا کر اسے جہاز پر کھینچ لوں گا۔ بظاہر ترکیب بہت عمدہ تھی اور اس میں کوئی خدشہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں نیزہ تان کر جہاز کے کونے پر کھڑا ہو گیا اور نیلے سمندر میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو میں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا۔ میری نظر تو صرف بڑی مچھلیوں پر تھی۔ کُچھ ہی دیر بعد مُجھے ایک بڑی مچھلی کا سر نظر آیا، پوری طاقت سے میں

نے ہارپون اس کی طرف پھینکا۔ خوش قسمتی سے میں نے رسّی کمر سے باندھ رکھی تھی۔ کی تھی عقل مندی مگر ثابت ہوئی بے وقوفی۔ مچھلی نے تڑپ کر زور سے ایک جھٹکا مارا اور اس جھٹکے کی وجہ سے میں لہراتا ہوا سمندر میں جا گرا۔ گرتے گرتے بھی میں نے چلّا کر مدد کے لیے آواز دی۔ اور پھر اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا کیوں کہ پانی میں گرتے ہی میرے اوسان جواب دے گئے تھے، جب یہ اوسان بحال ہوئے اور مُجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں سمندر کے سینے پر بڑی تیز رفتاری سے بہتا ہوا چلا جا رہا ہوں۔ مچھلی مُجھے کھینچ رہی ہے اور میں ایک تیز رفتار اسٹیمر کی مانند اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں، پانی کے چھپاکے اُڑ رہے ہیں اور میری آنکھیں کھاری پانی کی وجہ سے جلنے لگیں ہیں۔ بڑی مُشکل سے آنکھیں کھول کر میں نے گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ ہائے کیا بتاؤں کہ دِل کی کیا حالت ہوئی۔

میں نے دیکھا کہ ہمارے بادبانی جہاز کا دور دور بھی پتہ نہیں تھا۔

میری بے بسی اور بد نصیبی کا تصوّر کیجیے۔ اچھے اچھوں کا پتّا ایسے مقام پر پانی ہو جاتا ہے۔ مگر خطروں کی چکّی میں پِس کر اب میں ہیرا بن چکا تھا، اس لیے اس وقت بھی میں نے اپنے حواس قائم رکھے۔ خُدا سے صرف یہ دُعا مانگتا رہا کہ مچھلی سمندر کی تہہ میں نہ بیٹھ جائے اوپر ہی اوپر تیرتی رہے۔ یہ دُعا میں نے یوں مانگی تھی کہ اگر خدانخواستہ مچھلی تہہ میں جانے کی کوشش کرتی تو میں کسی بھی صورت سے نہیں بچ سکتا تھا۔ لیکن اگر وہ پانی کے اوپر ہی تیرتی رہتی تو میرے بچاؤ کی کُچھ نہ کُچھ صورت ضرور تھی۔ اور وہ صورت صرف یہ تھی کہ میں نے جلدی سے اپنی کمر میں لٹکا ہوا چاقو میان سے نکال لیا اور اندازے سے اپنی کمر سے بندھی ہوئی رسّی کو کاٹنا شروع کر دیا۔ رسّی پانی سے بھیگ کر سخت ہو گئی تھی، ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ نہ

کٹ سکی۔ میرا ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ آنکھیں بند تھیں، مگر میں کوشش کیے جا رہا تھا۔ جتنی بار بھی میں نے کوشش کی ناکامی ہی کا مُونہہ دیکھا۔ میں نے سوچ لیا کہ بس اب موت یقینی ہے، سوائے خُدا کی ذات کے اور کون ہے جو اس وقت میری مدد کرے گا؟ اپنے دردناک انجام کو یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے ہمّت ہار کر خود کو تقدیر کے سپرد کر دیا۔

مگر تقدیر کھڑی ہنس رہی تھی۔ خُدا کو منظور تھا کہ میں زندہ رہوں۔ چوں کہ مچھلی کے سر میں نیزہ گڑا ہوا تھا اِس لیے تکلیف کی وجہ سے وہ تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ کُچھ ہی دیر بعد میں نے اندازہ لگا لیا کہ مچھلی کی قوّت بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ تیزی سے بھاگنے کی بجائے اب وہ بہت سُست رفتاری سے آگے بھاگ رہی تھی۔ اور یہ رفتار بھی برابر کم

ہوتی جا رہی تھی، کم ہوتے ہوتے رفتار آخر کار بالکل نہیں کے برابر رہ گئی۔ اب میں سمندر کی سطح پر بالکل چِت لیٹا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ بھاگ دوڑ تو ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اطمینان سے چاقو کی دھار رسّی پر آزمائی جائے۔ اور پھر ایسا کرتے ہی جلد ہی میں اس عجیب بندھن سے آزاد ہو گیا۔ آزاد ہوتے ہی میں نے تیرنا شروع کر دیا اور تیرتے تیرتے میں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر پانچ چھ بار جان کو پکارا، مگر جان کا کہیں پتہ ہوتا تو جواب ملتا۔ جہاز کے بادبان بھی دور دور تک دِکھائی نہ دیتے تھے۔ آزاد ہونے کے بعد بھی میں بے بس و لاچار تھا۔ کیوں کہ اتنے بڑے سمندر میں آخر میں کب تک تیر سکتا تھا۔ پھر بھی جان بچانا فرض تھا۔ ذرا سی ہمّت و کوشش سے یہ جان بچ سکتی تھی۔ لہٰذا ہمّت کر کے میں نے آہستہ آہستہ تیرنا شروع کر دیا۔ کُچھ معلوم نہ تھا کہ کدھر جا رہا ہوں۔ نہ سمت کا پتہ تھا نہ رُخ کا۔ بس ہاتھ

پاؤں مارنے سے غرض تھی۔ شام ہو رہی تھی اور جوں جوں سورج دم توڑ

رہا تھا، میری سانسیں بھی جواب دیتی جا رہی تھیں اور جب چاروں سمت

گھرا اندھیرا چھا گیا تو میرا دِل بھی اندر ہی اندر ڈوب گیا۔ حالت یہ تھی کہ میں

دھاڑیں مار مار کر روتا جاتا تھا اور تیرتا جاتا تھا۔ خُدا جانے کب تک یہ

حالت رہی۔ ہاتھ پاؤں اب اکڑ گئے تھے۔ جسم کی طاقت ختم ہو گئی تھی۔

رہی سہی ہمّت نے جواب دے دیا تھا۔ میرے بازو شل ہو گئے تھے اور

میں ڈوبنے کے قریب ہی تھا کہ اچانک میرا جسم کسی سخت چیز سے

ٹکرایا۔ بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو زور لگا کر کھولا اور غور سے دیکھا تو معلوم

ہوا کہ میں کسی جزیرے کے کنارے سے ٹکرا گیا ہوں۔ زمین۔۔۔۔! بجلی

کی سی تیزی کے ساتھ یہ لفظ میرے دماغ سے ٹکرایا اور میرے سوئے

ہوئے اعضا میں اس نے یکایک چستی پیدا کر دی میں نے گھبرا کر کنارے

کو پکڑنا چاہا مگر ہاتھ پھسل گیا، جتنی بار میں نے کوشش کی ہاتھ پھسل پھسل گیا۔ خُدا جانے یہ کیسی زمین تھی جس کے کنارے اس قدر چِکنے تھے! ڈوبتے کو تنکے کا سہارا میں نے سوچا، اب جب کہ یہ چِکنی زمین مُجھے مل گئی ہے تو کیا میں اس زمین پر قدم نہ رکھ سکوں گا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ جب خُدا نے مُجھے ایک موقع دیا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا بے حد ضروری ہے۔ یہ سوچتے ہی میں نے ایک آخری زور دار کوشش اور کی اور پھر اس کوشش میں کام یاب بھی ہو گیا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی میں نے آگے دوڑنا شروع کر دیا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں یہ زمین کھو نہ جائے، مگر بھاگتے بھاگتے دس پندرہ مرتبہ پھسلا اور گر پڑا۔ زمیں بے حد چکنی تھی، اس لیے میں نے اٹھ کر آہستہ آہستہ قدم جما کر چلنا شروع کر دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس زمین پر نہ کوئی درخت تھا اور نہ چٹانیں اور نہ ہی کہیں مٹّی

نظر آتی تھی۔ خُدا جانے یہ کیسی زمین تھی؟

چاند آہستہ آہستہ بُلند ہو رہا تھا۔ اور اس کی ہلکی روشنی میں زمیں اب مُجھے پوری طرح نظر آ رہی تھی بالکل سیدھی اور سپاٹ زمین، جو مشکل سے دو فرلانگ مربع ہو گی یا پھر اسے ایک چھوٹا سا ٹاپو کہہ لیجئے۔ اچانک مُجھے خیال آیا کہ کہیں یہ وہی ڈوبنے ابھرنے والا جزیرہ نہ ہو! مگر فوراً ہی یہ خیال ذہن سے صاف ہو گیا۔ کیونکہ جیسا کہ مُجھے معلوم تھا، وہ جزیرہ تو پورے کا پورا سمندر میں غرق ہو گا۔ اور صرف چودھویں رات کو سمندر میں سے نمودار ہو گا۔ یہ سوچ کر میں آرام سے زمین پر بیٹھ گیا۔ تھکن بُری طرح سوار تھی، جان اور جیک سے بچھڑنے کا غم بھی تھا، اس لیے ہوا نے جب لوریاں دیں تو میری آنکھیں بند ہو گئیں اور پھر مُجھے دنیا و جہاں کی کوئی خبر نہ رہی۔

جب میری آنکھ کھلی تو سورج کافی اوپر چڑھ چکا تھا۔۔۔ میں گھبرا کا جلدی

سے اٹھ بیٹھا۔ پیاس بے حد لگ رہی تھی، اس لئے مجبوراً میں نے کنارے پر جا کر سمندر کے کھاری پانی کا صرف ایک گھونٹ پیا۔ کھارا پن تو محسوس ہوا مگر حلق تر ہو گیا۔ اس کے بعد میں جہاں بیٹھا تھا پھر وہیں واپس آ گیا۔ واپس آتے آتے بھی ایک دو بار پھسلا۔ زمین کو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ گہرے سرمئی رنگ کی عجیب سی چکنی اور سپاٹ زمین ہے نہ کہیں سے اونچی نہ نیچی۔ نہ کوئی گڑھا نہ کوئی کنکر! خُدا جانے میں کون سے غیر آباد جزیرے میں آ گیا تھا۔ ایسے جزیرے میں جہاں نہ گھاس تھی نہ مٹّی۔ عجیب سی لیس دار زمین تھی، اگر قدم جما کر اور سنبھل کر نہ چلتا تو دھڑام سے چاروں شانے چِت!

جہاز میں ایک آرام یہ تو تھا کہ میں کوئی بھی چیز آگ پر بھون کر کھا سکتا تھا۔ مگر اس جزیرے پر نہ تو لکڑی تھی نہ آگ۔ پھر بھلا بھوک کس طرح مٹ

سکتی تھی؟ پیٹ کی دوزخ کو تو بھرنا ضروری تھا۔ اس لیے جزیرے پر پڑی ہوئی چند مچھلیوں کو میں نے کچّا کھانے کی کوشش کی۔ مشکل سے صرف ایک لقمہ کھایا ہو گا کہ متلی ہونے لگی اس لیے مچھلیاں وہیں پھینک دیں۔ طبیعت بڑی گھبرا رہی تھی۔ کُچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتا تھا پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ آخر کس طرح اِس مُصیبت سے نجات حاصل کروں گا؟ جگہ ایسی تھی کہ آس پاس دوسرا کوئی جزیرہ بھی نظر نہ آتا تھا اور یہ جزیرہ جس پر میں اس وقت کھڑا ہوا تھا، میرے خیال میں شاید دینا کا سب سے عجیب اور حیرت انگیز جزیرہ تھا۔ میں نے بہت سے مقامات پر چٹّانیں دیکھی ہیں مگر یہ چٹّانیں یا ٹاپو تو اُن سب سے بالکل جُدا تھیں! اس کے بارے میں آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ بہرحال سب کُچھ خُدا پر چھوڑ کر میں آرام سے زمین پر بیٹھ گیا۔ دِل میں

سوچ لیا کہ اگر میرا آخری وقت آگیا ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت مُجھے مرنے
سے نہیں روک سکتی اور اگر مُجھے زندہ رہنا ہی ہے تو پھر آگ کے شعلوں
میں بھی میرا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ خاموشی سے بیٹھ کر میں سمندر کے
ہلکورے لیتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگا۔ لہریں جُدا جُدا ہو کر آپس میں پھر مل
جاتی تھیں۔ دِل نے یہ دیکھ کر خواہش کی کہ کاش میں بھی دوبارہ اپنے
ساتھیوں سے مل جاؤں۔ !لہروں پر نظر جما کر میں نے سامنے اُس مقام کو
دیکھنا شروع کیا جہاں سمندر آسمان سے مل رہا تھا اور پھر اس جگہ کو دیکھتے
ہی میرے جسم میں اچانک خوشی کی ایک تھرتھری سی پیدا ہو گئی۔ خُون
میں جوش پیدا ہو گیا اور میں جلدی سے کھڑا ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس چیز
کو دیکھنے لگا۔ نظر نے کہا وہم ہے مگر دِل نے گواہی دی کہ جو کُچھ دیکھ رہا
ہوں وہ حقیقت ہے واقعی بہت دور کے فاصلے پر مُجھے کسی جہاز کے

مستول نظر آ رہے تھے۔ اور وہ مستول آہستہ آہستہ لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ اس بات سے میں سمجھ گیا کہ جہاز میری ہی طرف آ رہا ہے۔ مستولوں کے بعد اس کے بادبان دکھائی دینے لگے۔ جغرافیہ کی کتابوں میں آپ نے یہ پڑھا ہی ہو گا کہ سمندر میں دور سے نظر آنے والے جہازوں کے سب سے پہلے مستول ہی نظر آتے ہیں۔ دراصل زمین گول ہونے کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے جو جغرافیہ داں ہمیں دیتے ہیں۔ یہ اندازہ لگا کر کہ جہاز اسی طرف آ رہا ہے، میرا دِل خوشی سے بھر گیا۔ خوشی کے مارے میں عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگا۔ اُچھل اُچھل کر دیکھا۔ کبھی جزیرے میں اِس طرف سے اُس طرف تک بھاگا، ہاتھ ہلائے اور زور زور سے مدد کے لیے چلّایا اور پھر جہاز جلد ہی مُجھے پورا نظر آنے لگا۔ یہ دیکھ کر میری خوشی دوگنی ہو گئی اور نہ جانے کیسے مُجھ سے وہ حرکت سر زد ہو گئی، کہتے ہوئے

بھی شرم آتی ہے، مگر کیا کروں، جب تک میں وہ بات آپ کو نہ بتاؤں گا

تب تک آپ میری بے تابی اور بے چینی کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتے۔۔۔

یہ سوچ کر کہ جہاز والوں کی نگاہ مُجھ پر پڑ جائے میں نے جلدی سے اپنی پھٹی

ہوئی پتلون اُتار ڈالی (قمیص تو پہلے ہی سے غائب تھی) اِس بات کا بھی

خیال نہیں کیا کہ میں اس وقت بالکل ننگا ہوں، کیسی شرم اور کیسی حیا!

جان پر بن رہی تھی اس لیے پتلون ہاتھ میں پکڑ کر میں نے اُسے زور زور

سے ہلانا شروع کر دیا۔ جزیرے کے اِس سِرے سے اُس سِرے تک

پتلون کو ہاتھ میں لہراتا ہوا بالکل ننگا بھاگنے لگا۔ میری یہ بات پڑھ کر ہو

سکتا ہے کہ آپ کو ہنسی آئے، لیکن میری حالت کا تصوّر کیجیے اور انصاف

سے کہیے کہ کیا میں ایسا کرنے میں حق بجانب نہیں تھا؟

میری خوشی کا کُچھ مت پوچھیے، جب میں نے یہ دیکھا کہ جہاز کے بادبانوں کا

رُخ پلٹا جا رہا ہے تا کہ جہاز جلد سے جلد مُجھ تک پہنچ سکے۔ جوں جوں جہاز میری طرف آ رہا تھا، مُجھ میں جوش بھر تا جا رہا تھا۔ دِل میں سوچ رہا تھا کہ خُدا جانے یہ کون لوگ ہیں؟ ویسے جہاز تو بالکل ہمارے جہاز جیسا ہے۔ خُدا کرے وہی ہو! پندرہ منٹ بعد جہاز اتنا قریب آ چکا تھا کہ میں اس پر کھڑے ہوئے لوگوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ فوراً ہی مُجھے خیال آیا کہ میں ننگا ہوں۔ جلدی سے میں نے پھٹی ہوئی پتلون پہنی اور بے تابی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگا۔ جہاز جب ایک فرلانگ کے فاصلے پر آ گیا تو میں جان اور جیک کو ڈیک پر بڑی بے چینی سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ ان دونوں کو دوبارہ پا کر پہلے تو خوشی کے مارے میری چیخیں نکل گئیں اور پھر دِل میں اچانک ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ روتا جاتا تھا اور ان دونوں کو دیکھتا جاتا تھا۔ جہاز اب اتنے قریب آ چکا تھا کہ میں نے جان

کو بلند آواز میں یہ کہتے سُنا۔

"روؤ مت فیروز! ہم آ گئے ہیں۔"

مگر میرا رونا بند نہیں ہوا۔ شاید یہ خوشی کا حد سے بڑھ جانا تھا جو میرے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ میری نظروں کے سامنے جہاز نے لنگر ڈالا اور ملّاح نے حفاظتی کشتی سمندر میں اُتاری اور پھر اِس کشتی میں جان اور جیک دونوں سوار ہو کر میری طرف آنے لگے۔ مگر میری وہی حالت تھی کہ لگاتار روئے جا رہا تھا۔ جیسے ہی کشتی جزیرے کے کنارے پر لگی جان فوراً اُس میں سے چھلانگ لگا کر جزیرے پر آ گیا اور پھر دوڑ کر اس نے مُجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ساتھ ہی اس نے بھی بُری طرح رونا شروع کر دیا۔ کُچھ دیر بعد جیک بھی میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور میرا شانہ تھپتھپا کر بولا۔ "اب مت روؤ فیروز! خُدا کا شکر ہے کہ تُم ہمیں مل گئے۔ ورنہ ہم تو

سمجھ بیٹھے تھے کہ تم سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔"

جان نے اُسی طرح روتے ہوئے کہا۔ "فیروز! میرے بیٹے، تمہارے کھو جانے کے بعد تمہاری قدر معلوم ہوئی۔ کیا بتاؤں کہ میں کتنا بے چین رہا ہوں، بیٹے آج مالک اور نوکر میں سے امتیاز مٹ گیا۔ تم پارٹی میں ملازم بن کر شامل ہوئے تھے۔ لیکن تم نے میرے دِل میں اتنا گھر کرلیا ہے کہ میں تم سے جُدا ہوکر ایک پل بھی سکون سے نہیں رہ سکتا۔ میرے بچّے تمہیں دوبارہ پاکر ایسا لگتا ہے جیسے میری کھوئی ہوئی دولت مُجھے مل گئی ہے۔۔۔
تمہارے کھوجانے کے بعد تو زندگی مُجھ پر حرام ہوگئی تھی فیروز!"

جان نے جب بہت تسلّی دی تب کہیں جا کر میرے آنسو تھمے۔ اسی کشتی میں بیٹھ کر ہم دوبارہ جہاز میں پہنچے اور وہاں جا کر میں نے ان سب کو اپنی کہانی سُنائی۔ پوری داستان سُن کر وہ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ ملّاح نے کُچھ

مچھلیاں بھونیں جنھیں کھا کر میں نے خُدا کا شکر ادا کیا اور پھر دوبارہ باتیں ہونے لگیں۔ جیک نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔

"جہاں تک مُجھے یاد ہے تم جہاز کی مخالف سمت گِرے تھے اور اس لحاظ سے جہاز کے پیچھے ہی پیچھے پانی میں بہتے چلے گئے تھے۔ ہمارا جہاز اگر شمال کی طرف جا رہا تھا تو تم جنوب کی طرف۔ پھر آخر تم ہم سے پہلے اس مقام پر کیسے پہنچ گئے جہاں اب ملے ہو!"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ خُدا معلوم کیا بات ہے؟"

"ہاں یہ واقعی اچنبھے کی بات ہے جیک۔" جان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"خیر اسے چھوڑو، میرے خیال میں اب ہم اس جزیرے کو کھود کر پینے کا پانی ضرور نکال لیں اور اپنے ڈرمز میں بھر لیں۔ یہ رات اس جزیرے پر

بسر کر کے ہم کل صُبح پھر روانہ ہو جائیں گے۔ تم یہیں ٹھیرو۔ میں اور جیک ملّاح کو لے جزیرے پر جاتے ہیں اور وہاں زمین کھودنا شروع کر دیتے ہیں۔"

میں نے ضِد کی۔ "اب میں اکیلا نہیں رہوں گا، مُجھے ڈر لگتا ہے اب تو میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ اس لیے میں بھی ساتھ چلوں گا۔" میری یہ بات سُن کر جان مُسکرایا اور پھر مُجھے ساتھ لے کر دوبارہ جزیرے پر گیا۔

جزیرے پر پہنچنے کے بعد وہ بھی تعجّب میں رہ گیا۔ ایک دو مرتبہ پھسل کر گِرا بھی اور پھر اٹھ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

"یہ کیسی عجیب زمین ہے فیروز۔ چکنی، لیس دار اور بالکل سپاٹ، نہ کوئی گھاس نہ درخت۔ چلتے ہوئے قدم بھی پھسلنے لگتے ہیں۔ آخر، تُم کس طرح اس پر چل پھر لیے؟"

"چلا کہاں جناب، پہلے پہلے تو میں بھی خوب گِراتھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے مخمل پر

پھر رہا ہوں۔"

"ہاں! مجُھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ خیر ہمیں اس سے کیا لینا۔ دیکھنا

یہ ہے کہ کھودنے پر اس میں پانی بھی نکلتا ہے یا نہیں؟"

ملّاح نے اُس کے اشارے پر زمین کھودنے کے لئے کُدال زمین میں

ماری مگر پھر اچانک ہم سب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ زمین میں سے ایک

فوّارہ اُبل پڑا مگر پانی کا نہیں، بلکہ گاڑھے گاڑھے خُون کا فوّارہ! خوف اور

دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کیوں کہ اب وہ جزیرہ

آہستہ آہستہ ہِل رہا تھا۔ خون کا فوّارہ دوبارہ زمین پر گر کر سمندر میں جا کر مل رہا

تھا اور سمندر کے آس پاس کے پانی کو سُرخ کر رہا تھا۔ جزیرہ اب زور سے

ہلنے لگا۔ جان نے یہ دیکھتے ہی زور سے چلا کر کہا۔ "تیزی سے کشتی کی

طرف بھاگو۔"

ہم سر پر پاؤں رکھ کر بری طرح بھاگے۔ عقل کام نہ کرتی تھی کہ آخر یہ بلا کیا تھی؟

مگر اتنا سمجھ ضرور آ گیا تھا کہ خطرہ ہے اس لیے جلدی جلدی ہم لوگ کشتی میں بیٹھے اور دو دو آدمیوں نے مل کر ایک ساتھ چپّو چلائے تب کہیں تین منٹ کے اندر اندر جہاز تک پہنچے۔ رسّی کی سیڑھی کے ذریعے جوں توں کر کے ہم اوپر چڑھے اور پھر کشتی کو اوپر کھینچ لینے کے بعد ہم نے اُس ہلتے ہوئے جزیرے کو دیکھا جو اب اور بھی تیزی سے ہل رہا تھا اور اس کی زمین سے خُون کا وہ فوّارہ لگاتار بُلند ہوتا جا رہا تھا۔ خُون کا فوّارہ جتنا اونچا ہو رہا تھا، جزیرہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ ہل رہا تھا۔ ہم دم بخود کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ملّاح بھی بالکل گُم صُم تھا۔ اچانک اُسے ہوش آیا اور اس نے

جلدی سے بادبان کھول دیے۔ جہاز آہستہ آہستہ اُس ہلتے ہوئے جزیرے سے دور ہونے لگا۔ کُچھ ہی دیر بعد جزیرہ بُری طرح ہلنے لگا۔ اور ہمارے سامنے وہ پہلی بار سمندر میں سے اوپر ابھرنے لگا چند منٹ میں وہ اتنا اونچا ہو گیا کہ ایک چھوٹی سی چٹان معلوم ہونے لگا اور تب مُجھے اس جزیرے کا وہ حصّہ نظر آیا جو اب تک میری نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ یہ حصّہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور جب ابھرا تو مُجھے ایک حیرت انگیز چیز نظر آئی یعنی ایک بہت بڑا سر، جس میں دو آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس سر کے آگے ایک بہت خوف ناک مُونہہ تھا جو بار بار کھُل اور بند ہو رہا تھا۔ خوف کے مارے میری ٹانگیں لرزنے لگیں اور میں جلدی سے ڈیک پر بیٹھ گیا۔

حقیقت اب معلوم ہوئی تھی۔ جس جزیرے پر میں نے ایک رات اور آدھا دِن گزارا تھا۔ وہ دراصل جزیرہ نہیں بلکہ کوئی بہت بڑی سمندری مچھلی تھی!

اتنے عرصے تک میں اس کی کمر پر بھاگتا رہا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ لیکن میرے خیال میں اسے خبر ضرور ہوئی ہوگی۔ اسے میرا وزن بھی ضرور محسوس ہوا ہوگا۔ مگر جس طرح انسان اپنے جسم پر مکّھی کا کوئی وزن محسوس نہیں کرتا، ایسے ہی اس دیوزاد مچھلی نے مُجھے سمجھا ہوگا۔ یعنی اُس کے لیے میرا وزن ایک مچھر کے برابر ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی کہ میں کافی دیر تک اس خطرناک مچھلی کی کمر پر رہا، مُجھے ڈر کے مارے چکّر آگیا۔ خود کو سنبھال کر جب میں نے سامنے دیکھا تو وہ مچھلی پانی میں بُری طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کی دم دائیں بائیں اتنے زور سے پڑتی تھی کہ سمندر کا پانی کئی سو فٹ اوپر اُچھل جاتا تھا۔ جس مقام پر وہ تھی وہاں درحقیقت طوفان آیا ہوا تھا۔ ہم نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ بچ گئے۔ اگر ہمارا جہاز اُسی جگہ کھڑا ہوا ہوتا تو یقیناً ہم جہاز سمیت کبھی کے سمندر میں غرق ہو گئے ہوتے۔ تڑپتے

تڑپتے وہ مچھلی بے جان سی ہو گئی اور پھر ہمیں پتہ نہیں کیا ہوا۔ کیوں کہ ہمارا جہاز اب اس سے اتنا دور ہو چکا تھا کہ ہمیں دوربین سے بھی یہ دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟

بڑی دیر تک تو ہم خاموش بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ حلق خُشک تھے۔ سمندر کا پانی صرف دو دو قطرے پینے کے باعث زبان کی نوک جگہ جگہ سے کٹ گئی تھی۔ اس لیے خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ مگر خاموش رہنے سے گھبراہٹ اور بڑھتی تھی۔ اس لیے میں نے آہستہ سے یہ خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"مُجھے تو رہ رہ کر ڈر لگتا ہے، اب سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ مچھلی راتوں رات مُجھے لے کر سمندر میں بیٹھ جاتی تو میں کیا کرتا!"

"واقعی بڑا حیرت ناک واقعہ ہے فیروز!" جان میری بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"سمندروں میں اِس سے بھی بڑی مچھلیاں ہوا کرتی ہیں۔ میں صرف سُنتا ہی تھا مگر آج دیکھ بھی لیا۔" میں نے خوف کی ایک پھریری لے کر کہنا شروع کیا۔

"اب بھی جب اس لیس دار کھال کا خیال آجاتا ہے، جس پر لیٹا ہوا تھا تو سچ متلی ہونے لگتی ہے۔"

میری یہ بات سُن کر جیک نے مُسکرا کر کہا۔

"تُم تو صرف یہی باتیں سوچ رہے ہو، لیکن میرا خیال کسی اور ہی طرف ہے۔ غور سے سُنو۔ اب مُجھے معلوم ہو گیا ہے کہ جہاز کے پیچھے مچھلی کے

ساتھ رسّی سے لٹکتے ہوئے جب تُم مخالف سمت میں بہہ گئے تھے تو پھر بعد میں ہمارے سامنے کیسے آ گئے؟"

"ہاں واقعی یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ آپ بتائیے!۔۔۔" میں نے حیرت سے کہا اور جیک کی باتیں توجّہ سے سُننے لگا۔

"بڑی آسان سی بات ہے۔ تُم سمجھتے رہے کہ تُم جزیرے پر ہو وہ ایک ہی جگہ کھڑا ہوا ہے۔ مگر اب جب کہ یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ وہ جزیرہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑی مچھلی کی کمر تھی تو حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے، تُم ایک ہی جگہ نہیں رکے رہے۔ بلکہ بڑی معقول رفتار کے ساتھ سمندر میں بہتے پھرے ہو۔ مچھلی ایک اچھّی رفتار سے سمندر میں گھوم کر ہمارے جہاز کے سامنے ہم سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ جس وقت تم اپنی پتلون ہوا میں لہرا رہے تھے اس وقت بھی وہ تیر رہی تھی۔ دراصل وہ کسی وقت بھی ایک جگہ

نہیں رکی، ہر لمحہ وہ تیرتی ہی رہی۔ اور تُم اس کی کمر پر سوار اسی رفتار سے سمندر میں چلتے رہے۔ چوں کہ مچھلی بہت بڑی تھی اس لیے تم یہ محسوس نہیں کر سکے کہ وہ تیر رہی ہے۔ اسے یوں سمجھو، جیسے کہ ہماری زمین گھوم رہی ہے مگر ہمیں محسوس نہیں ہوتا۔۔۔ بہر حال جو کُچھ ہوا وہ تو ہوا، ہمیں اب خُدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اِس بلا سے نجات ملی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو جیک۔" جان نے ایک لمبا سانس لینے کے بعد کہا۔ "واقعی ایسا ہی ہوا ہے۔ درحقیقت ہم ایک بہت بڑی مُصیبت میں گرفتار ہونے سے بال بال بچ گئے اور اب وقت آگیا ہے جب کہ سوچنا چاہیے کہ وہ جزیرہ اب کیسے تلاش کیا جائے؟ مگر نہیں، میں اتنا خود غرض بننا نہیں چاہتا۔ میں نے تم لوگوں کو خواہ مخواہ مصیبتوں کے غار میں دھکیل دیا ہے۔ میری وجہ سے تم بھی تکلیفیں جھیل رہے ہو اس لیے اب میں یہ سوچ رہا

ہوں کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم واپس کومورن چلے چلیں اور اس خوفناک سفر کواسی مقام پر ختم کردیں؟"

جیک نے یہ سُن کر جلدی سے جواب دیا۔ "واہ یہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ تو ہمّت ہار دینے والی بات ہوئی مسٹر جان۔"

میں نے بھی سینہ تان کر کہا۔ "نہیں ہمیں ہمّت نہیں ہارنی چاہیے، اتنے خطروں سے مُقابلہ کرنے کے بعد، اب جب کہ صرف ایک آخری خطرہ باقی رہ گیا ہے اس طرح پیچھے ہٹ جانا میرے خیال میں اچھّی بات نہیں۔"

"خیر ارادہ تو میرا یہی تھا۔ مگر تم لوگوں کی تکلیف کے خیال سے ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔ اب جیسا تُم کہتے ہو، میں وہی کروں گا۔" جان نے خوش ہو کر کہا۔ "لہٰذا اب ہمارا کام یہ ہے کہ اس جزیرے کو تلاش کرنا ہے جو ہماری آخری منزل ہے اور جس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے آس پاس کا

پانی گرم ہے۔"

جیک کُچھ دیر تک خاموش رہااور پھر بولا "اُسے تلاش کرنے کا کام میرے ذمّے چھوڑ دیجیے۔ میں آج ہی ملّاح کو ہدایت کر دیتا ہوں کہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پانی میں تیرتا رہے۔ جہاں اُس کے بدن کو پانی گرم لگے، فوراً مُجھے بتائے۔ اِس کے علاوہ ہم دوربینوں کی مدد سے پانی کی سطح کو بھی دیکھتے رہیں گے۔ جس مقام پر بھاپ اُٹھتی ہوئی نظر آئے گی، سمجھ لیں گے کہ اُس کے قریب ہی وہ جزیرہ ہے۔"

"بالکل ٹھیک تجویز ہے، میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی طریقہ ہو بھی نہیں سکتا لہٰذا ہم ایسا ہی کریں گے۔" جان نے اتنا کہہ کر دوربین پھر اپنی آنکھوں سے لگا لی۔

میں نے کمر سیدھی کرنے کے لیے تختے سے ٹیک لگا لی اور گُزرے ہوئے

واقعات پر خاموش بیٹھ کر غور کرنے لگا۔ جیک ملّاح کو ہدایات دینے کے لیے باہر ڈیک پر چلا گیا اور جان نے اپنے تھیلے میں سے ایک موٹی سی کتاب نکال کر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ملّاح اپنا خوف دور کرنے کے لیے بُلند آواز سے کوئی ایسا گانا گا رہا تھا جس کے الفاظ میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ جہاز آہستہ آہستہ ایک نامعلوم منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور پرندوں کی آوازیں اس خاموشی میں بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ جلد ہی رات ہو گئی اور ہر طرف ایک سکون سا چھا گیا۔ جیک اور جان دونوں سر جوڑ کر آپس میں کُچھ مشورہ کرنے لگے۔ اپنے ساتھ انہوں نے مُجھے بھی شامل کرنا چاہا، مگر میں اب اس قدر تھکا ہوا تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھنا بھی مُجھے دو بھر معلوم ہوتا تھا۔ خُدا جانے کب تک وہ دونوں اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ کیوں کہ جب میری آنکھ کھُلی تو سورج کی

کرنیں میرے مُونہہ پر پڑ رہی تھیں۔

اسی طرح ایک ایک کر کے کئی راتیں آئیں اور گزر گئیں۔ جہاز اسی طرح طوفانی لہروں کے تھپیڑے کھاتا سمندر کے سینے پر تیرتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا! ہم یہ بھی بھول گئے کہ وہ پُراسرار جزیرہ کب سمندر میں سے نمودار ہوا کرتا ہے؟ کھانے کا سامان بالکل ختم ہو چکا تھا۔ پانی کا اب ایک قطرہ بھی ہمارے پاس نہیں تھا۔ حلق سوکھ چکے تھے۔ ہاتھ پیروں میں سکت نہ رہی تھی۔ جہاز خود بخود جس طرف اس کا دِل چاہتا مُڑ جاتا۔ کیوں کہ ملّاح تھک کر اس قدر چُور ہو چکا تھا کہ اب وہ بادبانوں کی رسّیاں بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ یہ حالت تھی ہماری۔ ہم نے سمجھ لیا تھا کہ بس اب ہم چند ہی گھنٹوں کے مہمان ہیں!

اور پھر یہ اُسی دِن کا واقع ہے کہ ہم اَدھ مرے سے، جہاز کے کٹھرے کا

سہارا لیے بیٹھے تھے کہ یکایک ملّاح بُری طرح چلّایا۔ جان نے اُسے حیرت سے دیکھا تو وہ کسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس کی انگلی کی سیدھ میں جب ہم نے نظر جما کر دیکھا تو سمندر کی لہروں پر چند چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو مرا ہوا پایا۔ نگاہ جب آگے بڑھی تو سمندر کے درمیان ایک جگہ ہمیں ہلکی سی کُہر دِکھائی دی۔ بالکل ایسی ہی جیسے دھواں سردی کھا کر جم گیا ہو۔ ملّاح نے جان کا حُکم پا کر جلدی سے بادبانوں کا رُخ پھیر کر جہاز کا مُونہہ اس طرف کر دیا جہاں وہ کُہر نظر آئی تھی اور پھر ہمارا جہاز آہستہ آہستہ اُس طرف روانہ ہوا جہاں شاید ایک بہت بڑا خطرہ چھپا ہوا ہماری راہ دیکھ رہا تھا!

جیسے جیسے ہم کُہر کی طرف بڑھتے گئے، کُہر کا حجم بھی بڑھتا گیا۔ دور سے ہمیں یہ ایک چھوٹی سے لکیر نظر آتی تھی مگر اب معلوم ہوتا تھا کہ میلوں تک پھیلا ہوا یہ عجیب سا دھواں سمندر کے سینے پر ایک دیوار بن کر کھڑا ہوا

ہے۔ ہم ٹکٹکی لگائے سامنے دیکھ رہے تھے۔ دل بُری طرح دھڑک
رہے تھے، سانس بہت تیز ہو گئے تھے اور کسی بھی وقت ہم ایک
بھیانک حادثے سے دوچار ہونے کے لیے خود کو تیّار کئے ہوئے کھڑے
تھے۔ سمندر کے پانی پر مری ہوئی مچھلیوں اور دوسرے سمندری جانوروں
کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس لحاظ سے میری یہ پیش گوئی سچ ثابت
ہوئی تھی کہ جزیرے کے آس پاس کا پانی کافی گرم ہو گا۔ اس کی تصدیق
ملّاح پانی میں ہاتھ ڈال کر پہلے ہی کر چکا تھا۔ کسی خطرے کے آنے سے
پہلے دِل کی جو حالت ہوا کرتی ہے وہی ہو بہو ہماری تھی۔ سانس سینے میں
گھُٹے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ چہروں کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور بالکل
خاموش اور چپ چاپ کھڑے ہم حیرت زدہ نظروں سے دھوئیں کی اس
دیوار کو دیکھ رہے تھے جو دم بہ دم ہمارے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جان

اور جیک نے اپنے پستول ہاتھوں میں لے لیے میں بھی دوڑ کر اپنا ریوالور نکال لایا اور اب ایک طرح سے ہم اس ان جانے خطرے کا مقابلہ کرنے کو تیّار ہو گئے تھے!

وہ دھواں اب ہم سے مُشکل سے کوئی تیس گز رہ گیا تھا۔ ملّاح نے بادبان قابو میں کر رکھے تھے۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ اُسے کسی بھی وقت جہاز کے لوٹانے کا حُکم مل سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ جہاز اس دھوئیں کی طرف بڑھتا گیا اور پھر آخر کار دھوئیں کی چادر عبور کر کے اس سے آگے بڑھ گیا۔ اچانک ایک عجیب قسم کی بُو ہمیں محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ ہم گھرے بادلوں سے ڈھک گئے ہوں۔ دس فٹ دور کی چیز بھی آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود دِکھائی نہ دیتی تھی۔ سفید دودھیا رنگ کا دھواں ہر طرف چھایا ہوا تھا اور چوں کہ اس جگہ کا پانی کافی حد تک گرم تھا۔ لٰہذا پانی

سے ہلکی ہلکی سی بھاپ بھی اُٹھ رہی تھی۔ جہاں ہمیں اس بات کی خوشی تھی
کہ ہم منزل مقصود تک آ گئے ہیں، وہیں یہ ڈر بھی تھا کہ دیکھئے اب قسمت
کیا گُل کھلاتی ہے؟

جہاز برابر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمیں اپنے ہر طرف ایک دُھند سی نظر آتی
تھی۔ سورج کی تیز روشنی بھی اُس دُھند کے پار نہیں گُزر رہی تھی، اِس لیے
دِن کے بارہ بجے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کہ شام ہو گئی ہو! جان نے
ملّاح کو حُکم دیا کہ وہ سب بادبان کھول دے تاکہ ہم جلد سے جلد اُس مقام
سے آگے بڑھ سکیں، کیوں کہ اس جگہ دم سینے میں گھٹتا ہوا محسوس ہوتا
ہے۔ ملّاح نے حکم کی تعمیل تو کی مگر جہاز کی رفتار بڑھنے کی بجائے اور
گھٹ گئی۔ جان نے جب ملّاح سے اِس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا
کہ وہ بالکل نہیں جانتا کہ سب بادبانوں کے کھول دینے کے بعد جہاز اتنا

آہستہ کیوں چل رہا ہے؟

لیکن پھر جلد ہی اُس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ کیوں کہ چلتے چلتے جہاز اچانک پانی کے اندر کسی چیز سے ٹکرایا اور پھر چند ہچکولے لے کر رُک گیا۔ ہم نے جلدی سے نیچے جھانک کر دیکھا تو خوشی کے مارے دِل دھڑکنے لگا۔ جہاز کے نچلے حصّے کے آس پاس کُچھ ہرے پتّے نظر آ رہے تھی۔ جان نے ہمیں بتایا کہ دراصل ہم اُس خوف ناک جزیرے کی زمین پر پہنچ گئے ہیں۔ ہمارا جہاز کسی چٹان سے ٹکرا کر رُک گیا ہے اور چٹان پر یقیناً درخت بھی اُگے ہوئے ہیں۔ اِس بات کا جب مکمل یقین ہو گیا تو ملّاح نے بادبان اُتار کر لنگر ڈال دیا اور پھر ہم سہمے ہوئے انداز سے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے!

"یہی ہماری آخری منزل ہے۔" جان نے کُچھ سوچ کر کہنا شروع کیا۔

"اِس جزیرے میں ہی کہیں وہ مکھّی رہتی ہے، جس کی گرمی کے باعث سمندر کا اتنا حصّہ بے حد گرم ہے اور گرمی ہی کی وجہ سے پانی میں سے لگا تار بھاپ اُٹھ رہی ہے۔ یہی بھاپ دور سے ہمیں دھواں نظر آتی تھی۔ پہلے ہمارا جہاز جزیرے پر اُگے ہوئے درختوں سے اُلجھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اسی لیے اس کی رفتار ہلکی تھی۔ لیکن اب جس وقت یہ جزیرہ سے اوپر ابھرے گا، ہم لوگ بھی پانی کی سطح کے ساتھ ساتھ نیچے ہوتے جائیں گے اور جزیرے کی زمین سے لگ جائیں گے۔ جب ہمارے قدم زمین کو چھو لیں گے تب ہم سوچیں گے کہ پھر ہمیں کیا کرنا ہے۔ فی الحال تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ جزیرہ کب اُبھرے گا اور آخر کب تک ہم اِس گہری دُھند میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہیں گے؟"

"اگر حساب لگایا جائے تو جزیرہ کل یا پرسوں رات کو سمندر میں سے اُبھرے

گا۔ "جیک نے جواب دیا۔

"اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں دو تین دِن تک اس گندی فضا میں اور سانس لینا پڑے گا۔" جان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھّا۔ خیر یہی سہی، اِس کے علاوہ اور کوئی طریقہ بھی تو نہیں ہے۔ ہم اپنے کیبن کے اندر بیٹھ کر ہی یہ عرصہ گزاریں گے۔"

جان یہ کہہ کر کیبن میں چلا گیا۔۔۔ اور اس کے پیچھے پیچھے ہم دونوں بھی گئے۔ اندر جا کر پھر آپس میں بحث ہونے لگی۔ جیک کہہ رہا تھا کہ جزیرے کے بُلند ہونے پر اگر وہ خوف ناک مکّھی نظر آ گئی تو اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہو گا؟ یہ ہمیں ابھی سے سوچ لینا چاہیے۔ جان نے اس کا جواب یہ دیا کہ جب تک ہم میں سے کسی کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ مکّھی کیسی ہے، کتنی بڑی ہے، اس کی کیا خاصیتیں ہیں، ہم کُچھ نہیں کر سکتے۔ اِس میں کوئی شک

نہیں کہ کتابوں کے ذریعے ہمیں اس کے بارے میں پوری واقفیت ضرور ہے۔ مگر ابھی تک ہم نے اسے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا؟ اس لیے پہلے سے کُچھ نہیں کہہ سکتے۔ کافی دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ چونکہ اب جزیرے تک آ جانے کے بعد ہمیں کوئی خطرہ نظر نہ آتا تھا، اس لیے جلد ہی ہم اپنے بستروں میں جا لیٹے۔ دُھند گہری ہوتی جا رہی تھی اور اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ شام ہو رہی ہے اور رات آنے والی ہے۔ آنکھیں آپ ہی بند ہونے لگیں۔ اور پھر ہم گہری نیند سو گئے۔

صُبح جب میری آنکھ کھُلی تو سورج کی پہلی کرنیں کیبن کے اندر آ رہی تھیں۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھا تو ملّاح ابھی تک سو رہا تھا۔ جان اور جیک بھی اپنے اپنے پستولوں پر ہاتھ رکھے میٹھی نیند کے مزے لے

رہے تھے۔ میرے جی میں آئی کہ باہر چل کر دُھند کے پار کچُھ دیکھنا

چاہیئے۔ شاید کوئی ایسی خاص بات معلوم ہو جائے جو آگے پیش آنے

والے واقعات اور خطرات کو دور کر سکے۔ یہ سوچ کر میں نے آہستہ سے

دروازہ کھولا اور باہر ڈیک پر آگیا۔ مگر یہ دیکھ کر مجُھے بڑی حیرت ہوئی کہ

سمندر پر سے وہ دُھند اب غائب تھی اور دور دور تک نیلا آسمان دکھائی

دے رہا تھا۔ جوشِ اشتیاق میں میں اور آگے بڑھا۔ مجُھے یقین تھا کہ جہاز

ابھی تک اُسی چٹّان کے سہارے کھڑا ہوا ہو گا اور درختوں کی پتیاں نظر آ

رہی ہوں گی۔ دِل نے خواہش کی کہ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ بغیر دُھند کے وہ

چیزیں کیسی نظر آتی ہیں؟ یہ خواہش پوری کرنے کی خاطر میں نے جھک کر

نیچے دیکھا۔۔۔ مگر آہ، یہ کیا۔۔۔؟ خوف کے باعث میرے حلق سے

ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور میں سہم کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میرے جسم

پر لرزہ طاری تھا اور کمزوری کے باعث ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔

میری چیخ سن کر ملّاح بھی جاگ پڑا۔ مُجھے اِس حالت میں دیکھ کر جلدی سے وہ میرے پاس آیا، میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ وہ بھی جھُک کر دیکھے۔ اُس نے جب خُود جھُک کر جہاز کے نیچے دیکھا تو دہشت کی وجہ سے وہ بھی چلّانے لگا۔

خوف کے باعث اس نے اپنا مُونہہ چھُپا لیا۔ میں کیا بتاؤں کہ کیسا بُرا وقت تھا اچانک مُجھے پیچھے سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ یہ جان اور جیک تھے جو ہماری چیخیں سُن کر جاگ گئے تھے اور ہماری طرف آ رہے تھے۔ قریب آتے ہی انہوں نے ایک ساتھ گھبرا کر پوچھا۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟ یہ کیسی چیخیں تھیں؟"

اور پھر انہیں بھی وہ حیرت ناک حقیقت معلوم ہو گئی جس کی وجہ سے میں
خوف زدہ تھا۔ دُھند چونکہ نظر نہ آتی تھی اور آسمان صاف تھا۔ اس لیے
انہوں نے بھی جہاز کے کٹہرے سے نیچے جھُک کر دیکھا اور پھر فوراً ہی
گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ جان میں یہی ایک خوبی تھی کہ جب وہ خطرے کو
سامنے دیکھ لیتا تھا تو پریشان بالکل نہ ہوتا تھا۔ ہاں خطرے سے پہلے اس
کی پریشانی کی کُچھ انتہا نہ ہوتی تھی!

"اب کیا ہو گا؟" جیک نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

جان نے کُچھ جواب نہ دیا۔ بس خاموشی سے کُچھ سوچنے لگا۔ دیکھئے میں بھی
کتنا بے وقوف ہوں کہ اب تک آپ کو وہ بات ہی نہیں بتائی جس کے
باعث ہم چاروں گھبرا گئے تھے۔ مگر اسی سے آپ میری گھبراہٹ اور
بے چینی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کئی سال کے بعد جب اپنی یہ عجیب داستان

لکھتے ہوئے میں اتنا بوکھلا گیا ہوں تو اس وقت میرا کیا حشر ہوا ہوگا؟

بات دراصل بڑی حیرت انگیز ہے اور شاید کوئی اس کا یقین نہ کرے گا۔ ہمارا جہاز اس وقت ایک کافی اُونچے پہاڑ کی چوٹی پر ٹِکا ہوا تھا اور چوٹی پر قدرتی طور پر رکھی ہوئی دو بڑی اور مضبوط چٹانوں نے اُسے سہارا دے رکھا تھا، اگر وہ چٹانیں نہ ہوتیں تو وہ کبھی کا تقریباً پانچ سو فٹ کی گہرائی میں جا گِرا ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس وقت ہم جزیرے کی سطح سے اندازاً ۵۰۰ فٹ بُلند ایک پہاڑ کی چوٹی پر اپنے جہاز سمیت کھڑے تھے۔ ہم سے بہت دور، اور بہت نیچے نیلا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نہ دُھند تھی اور نہ کُچھ اور۔ دور دور تک زمین ہی زمین تھی۔ درخت تھے، چٹّانیں تھیں، نوکیلے پتھرّ تھے، مگر سب عجیب و غریب تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ چیزیں قدرتی نہیں ہیں بلکہ کسی نے آرام سے بیٹھ کر بنائی ہیں۔ درختوں، پتھرّوں

اور چٹانوں پر کائی جمی ہوئی تھی اور زمین پر ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ دِکھائی دیتی تھی۔ یہ تھا وہ عجیب و غریب جزیرہ! اور یہ تھی وہ نرالی زمین جس کی تلاش میں ہم سر گرداں تھے۔

"آخر یہ کس طرح مُمکن ہے؟" جیک نے ہلکی آواز میں کہا۔ میں نے اس کے لہجے کی کپکپاہٹ صاف طور پر محسوس کی۔

"ممکن تو ہے۔ یعنی جو کُچھ ہم دیکھ رہے ہیں حقیقت ہی ہے۔"

جان نے ایک لمبا سانس لینے کے بعد کہا۔ "اور میں تمھیں بتاتا ہوں کہ یہ سب کیسے ہوا۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں حساب لگانے میں غَلَطی ہو گئی اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ جزیرہ کل رات ہی کو سمندر میں سے نمودار ہو جائے گا تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ دُھند کے باعث ہمیں چاند بھی نظر نہ آیا تاکہ اُس کو دیکھ کر ہی کُچھ پتہ چلتا۔ جب ہم رات کو آرام کی نیند سو گئے تو جزیرہ

بڑی آہستگی سے اُبھرنا شروع ہوا اور ہمیں اِس کا علم ہی نہ ہو سکا۔ بد قسمتی سے ہمارا جہاز اس جزیرے کے ایک اُونچے پہاڑ کی چوٹی سے ٹکرایا تھا۔ پہلے ہم سمجھے تھے کہ وہ کوئی چٹان ہے، لیکن اب پتہ چلتا ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی تھی، جب جزیرہ ابھرا تو پہاڑ بھی اونچا ہوا، پہاڑ کے ساتھ ہی ہم بھی بُلند ہوتے گئے اور اب اس حالت میں ہیں جو ہمارے سامنے ہے۔ یعنی جزیرے کی زمین سے تقریباً پانچ سو فٹ بُلند۔"

"میں بھی یہی سمجھا تھا۔ آپ نے بالکل ٹھیک بات نوٹ کی۔" جیک نے آہستہ سے کہا۔ "مگر اب کیا ہو؟"

"اب سب سے بڑی مُشکل یہ ہے کہ اُترنے کو تو ہم اس پہاڑ سے نیچے اُتر سکتے ہیں۔ مگر جہاز کا کیا ہو گا۔؟ اسے کس طرح اُتارا جائے گا۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور اس کے لیے سب کو ہی سوچنا چاہیئے۔" جان نے

جواب دیا۔ بڑی دیر تک ہم خاموشی سے اس مسئلے پر غور کرتے رہے کہ جہاز کو اتنی بُلندی سے کس طرح زمین پر اُتارا جائے۔ جب کوئی حل سجھائی نہ دیا تو جان نے کہا۔

"جہاز کو تو یہیں چھوڑو اور خود نیچے اترنے کی کوشش کرو۔ ہمیں ابھی تک یہ بالکل معلوم نہیں کہ اس جزیرے میں آبادی بھی ہے یا نہیں! لیکن پھر بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ ہم جہاز کی بھی حفاظت کریں کیوں کہ یہی ہماری واپسی کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اس کی حفاظت اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہم اسے دوسروں کی نظر سے چھپائیں۔ اس مقصد کے لیے میں نے ایک طریقہ سوچ لیا ہے۔ پہاڑ کی اِس چوٹی پر اُگے ہوئے درختوں کی بڑی بڑی ٹہنیوں کو کاٹ کر، جہاز اُن سے ڈھک دیں تاکہ وہ کسی کو نظر نہ آئے۔"

جان کی یہ بات ہمیں بے حد پسند آئی۔ جلدی جلدی ہم نے درختوں کی
ٹہنیاں کاٹیں اور پھر جہاز کو اُن ٹہنیوں کے پتّوں سے بالکل ایسے ڈھک دیا
کہ دور سے وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے بعد ضروری سامان،
ہتھیار، اور دوسری چیزیں لے کر ہم چاروں موٹے موٹے رسّوں کی مدد
سے نیچے اُترنے لگے۔ پہاڑ پر بہت زیادہ کائی جمی ہوئی تھی۔ قدم بار بار
پھسل رہے تھی، اگر ہم چاروں کی کمر سے رسّے نہ بندھے ہوتے تو ہم میں
سے کوئی نہ کوئی یقیناً اتنی بُلندی سے ضرور نیچے گر پڑتا۔ ایک ایک قدم جما
جما کر رکھتے ہوئے آخر کار ہم بڑی مشکل سے نیچے اتر آئے۔ زمین پر قدم
رکھتے ہی احساس ہوا کہ زمیں پر دلدل سی ہے۔ ساتھ ہی اس دلدل پر عجیب
قسم کی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ پورے جزیرے میں صرف ایک ہی رنگ نظر
آتا تھا۔ سبز، ہر چیز سبز رنگ کی تھی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہر جگہ

کائی جمی ہوئی تھی! جزیرے میں صُبح کے وقت بھی بہت گرمی تھی۔ زمین سے لگاتار ہلکی سی بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ جس جگہ بھی قدم رکھتے معلوم ہوتا کہ ہلکے گرم توے پر پاؤں پڑ گیا ہے ایسا لگتا تھا جیسے اس جزیرے کے نیچے آگ دہک رہی ہے۔ ہر سمت ایک ہیبت سی چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ نہ تو کوئی جانور دِکھائی دیتا تھا اور نہ کوئی پرندہ۔ زندگی کے ذرا سے بھی آثار نہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ جزیرہ درحقیقت کسی دوسری دُنیا سے آیا ہے۔ ہماری دُنیا کا نہیں ہے۔ کیوں کہ پہاڑ اور چٹّانیں عجیب طرح کی تھیں اور درخت بھی ہماری دُنیا جیسے نہ تھے۔ بس یوں سمجھئے کہ جیسے ہم خوابوں کے جزیرے میں آ گئے تھے۔

سب سے حیرت انگیز چیز جو ہمیں کُچھ دیر بعد نظر آئی وہ یہ تھی کہ دور دور سے سمندری پرندے اس جزیرے کی طرف آتے ہوئے دِکھائی دے

رہے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید میری نظر کا دھوکا ہے۔ یہ پرندے یوں ہی اس طرف آ رہے ہیں اور شاید جزیرے کے اوپر سے اُڑ کر دوسری طرف نکل جائیں گے۔ مگر جب میں نے چاروں سمت گھوم کر دیکھا تو حیرت کے مارے گنگ ہو کر رہ گیا۔ چھوٹے بڑے ہر قسم کے پرندے اس جزیرے ہی کی طرف تیزی سے آ رہے تھے۔ جب میں نے جان کو یہ بات بتائی تو اسے بھی بہت تعجّب ہوا۔ خُدا جانے کیا آفت آنے والی تھی! اس لیے ہم احتیاطاً جلدی سے چند جھاڑیوں کے پیچھے چھُپ گئے۔ پرندے آہستہ آہستہ قریب آتے جا رہے تھے۔ تعداد میں وہ اتنے زیادہ تھے کہ جب وہ جزیرے کے اوپر آ گئے تو سورج کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ جزیرے کے اوپر آتے ہیں انہوں نے نیچے اُترنا شروع کیا اور پھر تیزی سے چٹّانوں پر لگی ہوئی وہ کائی کھانے لگے، جس کی عجیب سی بُو

ہمارے دماغ تک کو سڑائے دے رہی تھی۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت تعجّب ہوا، مگر اس سے بھی زیادہ تعجّب اس وقت ہوا جب ہم نے دیکھا کہ پرندے وہ کائی کھا کر یکایک اپنا توازن کھوبیٹھے۔ وہ اب اِس طرح اُڑ رہے تھے جیسے کوئی زخمی پرندہ اڑتا ہے، ڈانواں ڈول! یعنی کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ کئی تو جلدی سے دلدلی زمین پر جا کر بیٹھ گئے اور ایک بڑی تعداد بڑی مشکل سے درختوں کی ٹہنیوں پر اُڑ کر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے بعد بھی وہ ٹہنیوں پر اس طرح ڈول رہے تھے جیسے کہ انھوں نے افیون کھالی ہو اور ان پر نشہ طاری ہو گیا ہو! میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان میں سے بیش تر تو ہلنے جلنے سے اس حد تک معذور ہو گئے تھے کہ اگر کوئی دوسرا پرندہ کسی کے برابر میں آ کر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو پہلا اسے جگہ ہی نہ دے دیتا تھا اور نتیجہ کے طور پر آنے والا پرندہ لہراتا ہوا درخت سے نیچے جا گِرتا اور دوبارہ اٹھنے کی کوشش نہ

کرتا!

یہ حالت دیکھ کر جان نے کہا۔ "خُدا جانے یہ کیا ماجرا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پرندوں کو کیا ہوگیا ہے؟"

"میرا خیال ہے ہم کسی طِلسم ہوش ربا میں پھنس گئے ہیں!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"شاید اس کائی میں ہی یہ خاصیّت معلوم ہوتی ہے کہ وہ پرندوں کو بے بس کر دیتی ہے۔" جیک نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"سوال یہ ہے کہ اِس کا مطلب کیا ہے؟" جان نے کہا۔ "کیا یہ سب کُچھ ہماری وجہ سے ہو رہا ہے کہ ہم ان پرندوں کو اُٹھا کر لے آئیں اور بھون کر کھالیں یا پھر یہ کسی خاص طاقت کا کرشمہ ہے!"

"خُدا ہی بہتر جانتا ہے۔ "میں نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ میرا دماغ بھی اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔۔۔ پرندے برابر اُڑتے ہوئے آ رہے تھے اور کائی کھا کھا کر مفلوج ہو رہے تھی۔ ہم حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے کہ شاید اب کُچھ ہو۔ مگر کُچھ نہیں، پرندوں کے شور کے علاوہ کُچھ نہ تھا۔ دِل کہہ رہا تھا کہ کوئی بہت ہی خوف ناک واقعہ پیش آنے والا ہے، مگر ہوتا کُچھ نہ تھا۔ ایسی حالت میں انسان کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جب طوفان کے آثار ہوتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ طوفان آ کر جلد سے جلد گزر جائے، مگر ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ ہم لوگ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار تھے اور چاہتے تھے کہ جو کُچھ ہوتا ہے جلد سے جلد ہو جائے۔ یہی سوچتے سوچتے کہ شاید اب کوئی بات ہو شاید کوئی نئی بات معلوم ہو۔ دوپہر ہو گئی، دوپہر سے شام اور شام

سے پھر رات! رات ہوتے ہی ہمیں اپنے سانس سینے میں گھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ عجیب جگہ اندھیرا ہیبت ناک خاموشی، درختوں کی ٹہنیوں پر اونگھتے ہوئے پرندے، دور سے آنے والی سمندر کی خوف ناک سائیں سائیں۔۔۔! میں کیا بتاؤں کہ اس وقت ہماری کیا حالت تھی؟ خوف اتنا تھا کہ اگر پتّہ بھی کھڑکتا تو ہم چوکنے ہو جاتے۔ اب جب وہ وقت یاد کرتا ہوں تو ہنسی آجاتی ہے کیوں کہ ایک بار جب میں نے اندھیرے میں ملّاح کا شانہ پکڑ کر کُچھ کہنا چاہا تو وہ ایک ڈراؤنی چیخ مار کر اُچھل پڑا۔ اس کی چیخ بار بار پہاڑیوں اور چٹّانوں میں گونجتی رہی اور ہم احمقوں کی طرح باری باری جس طرف سے آواز آتی اس طرف دیکھتے رہے۔ مزے کی بات یہ کہ جزیرے میں اب صرف پرندوں کے پر پھڑپھڑانے کا ہلکا سا شور تھا اور ویسے ہر طرف ہو کا عالم تھا۔۔۔!

جھاڑیوں کے پیچھے آخر، ہم کب تک چھپے رہتے۔ لہٰذا اس جگہ سے نکل کر چھپتے چھپاتے آہستہ آہستہ ایک بہت بڑی چٹّان کے نیچے جا پہنچے۔ جان نے ٹارچ جلا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ چٹّان کے نیچے ایک کافی بڑا اور لمبا غار ہے۔ غار کے اندر روشنی ڈالنے سے پتہ چلا کہ وہ اتنا بڑا ہے کہ ہم چاروں اس میں آرام سے رات گزار سکتے ہیں۔ جیک سب سے پہلے اس کے اندر داخل ہوا اور پھر ہم تینوں بھی ایک ایک کر کے اندر آ گئے۔ جان نے روشنی ہر طرف ڈالنے کے بعد اطمینان کر لیا اور پھر بولا۔

"رات بسر کرنے کے لیے یہ جگہ بہت اچھّی ہے۔ کیوں کہ یہاں ہم ہر طرح کے خطرے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

"مگر غار کا یہ مُونہہ تو کھُلا ہی رہے گا!" جیک نے جلدی سے کہا۔

"غار کے برابر ہی باہر ایک بہت بڑا پتھّر پڑا ہوا ہے۔ اسے غار کے مُونہہ پر

لگا دو۔ ملّاح سے کہو کہ وہ اس کام میں تمہاری مدد کرے۔" جان نے جواب دیا اور پھر جیک اور ملّاح نے مل کر فوراً یہ کام کر دیا۔

میں خاموشی سے غار کا مُونہہ پتھرّ سے بند ہوتے دیکھتا رہا۔ لیکن اچانک مُجھے ایک بات سوجھی۔ اور میں نے جان سے کہا۔

"مگر سب سے بڑے دو خطرے تو ابھی اور بھی باقی ہیں۔ ان سے بچنے کی بھی تو ترکیب سوچیئے۔ یعنی پہلی تو وہ خوف ناک مکھّی، چلیے مان لیا کہ اس سے بچنے کے لیے ہم غار میں چھُپ گئے ہیں اور غار کے مُونہہ پر پتھرّ بھی رکھ دیا ہے مگر یہ پتھرّ ہمیں نقصان بھی تو پہنچا سکتا ہے۔ ہمیں جزیرہ کی زمین تو اب نظر آتی ہی نہیں۔ باہر کا حصّہ سب چھپ گیا۔ لہٰذا فرض کر لیجئے کہ راتوں رات اگر یہ جزیرہ سمندر میں غرق ہو گیا تو پھر۔۔۔ پھر ہم کیا کریں گے۔؟"

”اتنا خطرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا فیروز!“ جان نے کہنا شروع کیا۔ ”اوّل تو جزیرہ رات کو غرق ہو گا نہیں اور فرض کر لیا جائے کہ ہو بھی جاتا ہے تو پھر ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہو گا کہ ہم پتھرّ ہٹا کر تیرتے ہوئے اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کریں جس پر ہمارا جہاز ٹِکا ہوا ہے۔“

بات بالکل ٹھیک تھی۔ واقعی اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ بھی نہیں تھا۔ زمین صاف کرنے کے بعد ہم اسی حالت میں ننگے بدن لیٹ گئے۔ زمین گیلی تھی مگر ہم لوگوں نے اتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں کہ اب کوئی سی بھی تکلیف نظر میں نہ جچتی تھی۔ نیند بُری طرح آ رہی تھی۔ اس لئے وہ گیلی زمین بھی ہمیں اس وقت مخمل کا فرش معلوم ہوئی۔ لیٹتے ہی فوراً سب کی آنکھ لگ گئی۔ خُدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم کتنی دیر سوئے؟ میں اپنے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مشکل سے دو گھنٹے ہی سویا ہوں گا کہ اچانک ایک

پُراسرار سرسراہٹ سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

حالاں کہ غار میں گھُپ اندھیرا تھا۔ مگر اس اندھیرے میں بھی مُجھے غار سے باہر ایک تیز روشنی نظر آئی۔ روشنی کبھی تیز ہو جاتی اور کبھی آہستہ آہستہ ہلکی ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی۔ پھر تیز ہوتی اور پھر ہلکی۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجیب آواز۔ ایسی آواز جسے میں الفاظ میں کسی بھی صورت سے بیان نہیں کر سکتا، مُجھے سُنائی دے رہی تھی۔ یوں سمجھئے کہ مٹّی کے تیل سے جلنے والے اسٹو میں سے جس قسم کا سراٹا نکلتا ہے۔ بس ہو بہو ویسی ہی آواز تھی ساتھ ہی مُجھے یوں محسوس ہوا جیسے غار سے باہر طوفان آیا ہوا ہے۔ درختوں کے پتّوں کے آپس میں ٹکرانے سے جو شور پیدا ہوتا ہے، اسی قسم کا تیز شور سُنائی دے رہا تھا اور اس کے علاوہ کسی چیز کے

گھسٹ کر چلنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ دھڑکتے دِل کو قابو میں کیے اور سانس روکے ہوئے میں وہ آوازیں سُن رہا تھا۔ اتنی ہمّت بھی نہ تھی کہ جان یا جیک میں سے کسی کو جگا لوں۔ خوف اتنا تھا کہ شاید ہی کبھی زندگی میں دل میں اتنا خوف پیدا ہوا ہو۔۔۔! سہمی ہوئی نظروں سے بس میں اسی سمت دیکھے جا رہا تھا جہاں وہ روشنی جل اور بُجھ رہی تھی۔ بڑی دیر تک میں اسی طرح لرزتا اور کانپتا رہا اور پھر اچانک ایک تیز سیٹی مُجھے سُنائی دی۔ بڑی تیز اور ہیبت ناک! بالکل ایسی جیسی کہ آج کل ہماری ریلوں کے انجن کی سیٹی ہوتی ہے۔ اس آواز کو سنتے ہی میں اُچھل پڑا اور میں نے جلدی سے جان کے سرہانے سے ٹارچ اٹھا کر جلالی۔ اچانک وہی آواز پھر آئی۔ اب کے وہ اتنی تیز تھی کہ جان بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور مُجھے جاگتے ہوئے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کیوں فیروز کیا بات ہے کیوں جاگ رہے ہو۔ یہ آواز کیسی تھی؟"

آواز پھر آئی۔ مگر اس بار وہ کافی دور سُنائی دیتی تھی۔ جان کی آواز سن کر جیک اور ملّاح بھی جاگ گئے تھے اور پھٹی پھٹی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ میرے قلم میں طاقت نہیں کہ اپنی اس وقت کی حالت کو ٹھیک طرح لکھ سکوں۔ بلا وجہ میں اپنا ڈر ظاہر کر کے آپ سب کو جو میری آپ بیتی پڑھ رہے ہیں، خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا۔ یوں سمجھئے کہ ہم چاروں دم سادھے خاموش بیٹھے رہے حتّیٰ کہ پَو پھٹنے لگی اور اب وہ عجیب سی آوازیں وہ سراٹا اور شور سب ختم ہو گیا۔ سب طرف ایک سکون سا چھایا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جان نے غار کے دروازے کے پاس جا کر ایک جھری میں سے باہر جھانکا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ باہر کوئی خطرہ نہیں ہے تو ہم سے کہا کہ پتھرّ ہٹا کر اب ہمیں اس غار سے باہر نکلنا

چاہیے۔

پتھرّ ہٹایا گیا اور پھر ہم دبے پاؤں باہر آئے۔ سورج سمندر کے اندر سے نکل رہا تھا مگر ہوا میں تپش ابھی سے تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کہیں قریب ہی کوئی بھٹّی سلگ رہی ہے۔ اوپر نیچے ہر طرف دیکھتے اور کسی انجانے خطرے کی بُو سونگھتے ہوئے ہم غار سے کُچھ دور آگے بڑھ گئے اور پھر ہم نے وہ چیز دیکھی جس سے ہماری عقلیں دنگ ہوگئیں۔ کسی بھی درخت کی ٹہنی پر یا زمین پر اب کوئی سا بھی پرندہ نظر نہ آتا تھا۔ اگر آتا بھی تو جلا ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے آگ پر بھونا ہو! اس کے علاوہ جن ٹہنیوں پر پرندے بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی اب بالکل کوئلہ بن گئی تھیں۔ آس پاس کی گھاس اور جھاڑیاں سب کی سب جلی ہوئی تھیں اور حالت یہ تھی کہ ابھی تک ان میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ جیسے ہی میری نظر نیچے زمیں پر پڑی،

خوف کی وجہ سے ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ زمین پر دس گز کی دوری پر دو بڑے بڑے سے گڑھے نظر آ رہے تھے۔ قریب جا کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ گڑھے کم از کم تین فٹ گہرے ہیں۔ میری عقل تو یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر راتوں رات یہ گڑھے زمین میں کس طرح پیدا ہو گئے؟ شاخیں کس طرح جل گئیں اور پرندے غائب ہو گئے۔ میں جان سے اس کا سبب پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے خود کہنا شروع کر دیا۔

"اف خُدا۔ یہ ہے وہ خوف ناک مکھّی!"

"کہاں ہے۔؟" ہم تینوں نے ایک ساتھ گھبرا کر پوچھا۔

"ابھی تو نہیں ہے، مگر رات کو وہ ضرور آئی تھی۔ زمین میں پڑے ہوئے یہ گڑھے دراصل اس کے پیروں کے نشان ہیں۔ نشانوں کی گہرائی سے تم اس کے وزن کا اندازہ لگا سکتے ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی نوٹ کرو کہ ہر پیر

کی موٹائی کتنی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہاتھی نے اپنے پاؤں جگہ جگہ رکھے ہیں۔ خیر اب میری سمجھ میں سب کُچھ آگیا ہے۔"

"کیا سمجھ میں آگیا ہے؟" جیک نے دریافت کیا۔

"اس جزیرے کی کائی پرندے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ مگر کائی میں کُچھ ایسی نشہ کی خاصیت ہے کہ پرندے یہ کائی کھاتے ہی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ تب رات کو وہ خوف ناک مکھّی شُعلے اُگلتی ہوئی اپنے غار میں سے باہر نکلتی ہے اور ان پرندوں کو چٹ کر جاتی ہے۔ پہلے میں سوچا کرتا تھا کہ اتنی بڑی دیو زاد مکھّی بھلا کس طرح اُڑتی ہوگی؟ مگر اب یہاں آکر اس بات کا اندازہ ہوا کہ وہ اُڑ نہیں سکتی۔ البتّہ مینڈک کی طرح کُچھ فاصلے تک پھُدک ضرور سکتی ہے۔ جو مکھّی اُڑ کر اپنا شکار تلاش نہ کر سکے اس کے لیے قدرت نے خوراک حاصل کرنے کا یہ انوکھا انتظام کر دیا ہے کہ پرندے

دور دور سے اس کا شکار بننے کے لیے خود بخود کھچے چلے آتے ہیں۔"

"شاید ہم بھی اِسی لیے آ گئے ہیں۔" ملّاح نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔ "کہ اس دیوزاد مکھّی کی خوراک بنیں۔"

"احمق نہ بنو۔" جان نے اُسے ڈانٹا۔ "ہم اِس مکھّی سے چھُٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ سوچ لیں گے۔ فی الحال تو یہی بہتر ہے کہ ہم رات کو اپنے اس غار میں سے کہیں باہر نہ نکلیں۔ ہمارے حق میں یہی سب سے اچھّا ہے۔ دِن کو ہم پورے جزیرے میں گھوم کر اُس مکھّی کا گھر تلاش کریں گے اور پھر اسے ختم کرنے کا طریقہ ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہمیں یہ کام چودہ دِن کے اندر اندر کرنا ہے۔ کیا میری اس بات کو سب سمجھ گئے؟"

"جی ہاں سمجھ گئے۔ اب چوں کہ دِن نکل آیا ہے لہٰذا آئیے اب اُس مکھّی کا گھر تلاش کر لیں۔" میں نے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ جان نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر ایک بات پہلے سب سن لیں، اور وہ بات یہ ہے کہ اگر اتّفاق سے ہمارا سامنا اس مکھّی سے ہوگیا تو سب سے پہلا کام ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ پوری طاقت سے دوڑتے ہوئے سمندر کا رُخ کریں گے۔ سمندر کے اندر پہنچ کر ہی ہم اس سے محفوظ رہ سکتے ہیں ورنہ اور کوئی طریقہ اس سے بچنے کا نہیں ہے۔“

ہم نے اپنی گردنیں ہلا کر جان کو بتایا کہ ہم ایسا ہی کریں گے۔ اس کے بعد ہم آہستہ آہستہ جزیرے کی دوسری سمت میں چلنے لگے۔ بار بار مُڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتے بھی جاتے تھے کہ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں پستول تھے۔ دِل بُری طرح دھڑک رہے تھے اور ہمارے جسموں سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ سب ننگے جسم تھے۔ پتلونیں نیکر

بن چکی تھیں اور اب یہ نیکر بھی چیتھڑے بن گئے تھے۔ کوئی ہمیں اس وقت دیکھتا تو یقیناً یہی سمجھتا کہ ہم آج سے لاکھوں سال پہلے کے جنگلی انسان ہیں جو تہذیب سے بالکل ناآشنا تھے اور جنھوں نے کپڑے پہننا بھی نہ سیکھا تھا۔ مُجھے افسوس ہے کہ اس سفر میں میرے پاس کیمرہ نہیں تھا ورنہ آپ اس موقع کی ہُو بہُو تصویریں دیکھ سکتے تھے (اب بھی اپنے تخّیل کی مدد سے میں نے ایک مصوّر سے خاص خاص موقعوں کی تصویریں بنوائیں ہیں) خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے برابر آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جس طرف اس خطرناک مکّھی کے پیروں کے گڑھے جا رہے تھے ہمارا رُخ بھی اسی طرف تھا۔

کُچھ ہی دیر بعد ہمیں اپنے سامنے دو اُونچے پہاڑ دکھائی دیے۔ ان پہاڑوں کے درمیان ایک راستہ تھا۔ راستہ کیا بلکہ گلی کہہ لیجیے اسے۔ جس طرح گلی

کے دونوں طرف اُونچے مکان ہوتے ہیں اسی طرح یہ دو پہاڑ تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ دائیں طرف کے پہاڑ کی چوٹی پر ایک بہت بڑی چٹان ٹھیری ہوئی تھی۔ ایک تو یہ معلوم کرنے کا شوق کہ یہ چٹّان چوٹی پر کس طرح جمی ہوئی ہے، دوسرے یہ سوچ کر کہ مُمکن ہے اس پہاڑ پر چڑھ کر ہمیں اس خوف ناک مکّھی کا غار نظر آ جائے، ہم نے یکایک پہاڑ کی طرف بھاگنا شروع کر دیا اور پھر چاروں اس پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ پہاڑ کافی اونچا تھا اور ہم چاروں بڑی دِقّت کے بعد اُس پر چڑھے۔ دِقّت یوں ہوئی کہ اس پہاڑ پر بھی کائی جمی تھی جس کی وجہ سے پھسلن تھی۔ مگر ایک لمبی رسّی کو اپنی کمروں سے لپیٹ کر ہم اوپر چڑھتے ہی گئے۔ جان سب سے پہلے وہاں پہنچا اور رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کے بعد ہم بھی آہستہ آہستہ اوپر پہنچ گئے۔

وہاں پہنچ کر ہم نے دور دور تک نظر دوڑائی۔ کافی فاصلے پر نیلا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہوائیں گرمی بڑھتی ہی جا رہی تھی اس خوفناک مکّھی کے پیروں کے نشان جس سمت میں جا رہے تھے، ہم نے ادھر نظر اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہم سے کافی دور، تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک بہت بڑا اور گہرا گڑھا ہے اور یہ عجیب سے نشان اُسی گڑھے میں جا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی گڑھے میں سے بھاپ بھی اُٹھ رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ بھاپ آگ کی لپٹ میں بھی بدل جاتی تھی۔ یہ دیکھ کر جان نے ہمیں بتایا کہ دراصل وہ خطرناک مکّھی اِسی گڑھے میں رہتی ہے۔ صُبح کے وقت وہ گڑھے سے باہر آتی ہے اور پرندوں کو اپنی ناک سے نکلنے والے شعلوں سے بھون کر کھا جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب تک ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں، اسے ختم کرنے کا طریقہ ہمارے

ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم اپنے غار میں واپس چلیں اور اگلے دِن اِس مکھّی کو کسی چٹان کی آڑ میں چھُپ کر دیکھیں۔ اتنا کہہ کر جان نے سہارے کے لیے اپنا ہاتھ اس چٹّان سے لگایا جو اس پہاڑ کی چوٹی پر ٹکی تھی۔ اچانک ایک زور دار گڑگڑاہٹ ہوئی اور وہ چٹّان اس طرح ہلنے لگی جیسے ربڑ کی بنی ہوئی ہو۔ ہم حیرت سے کھڑے اُسے ہلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ کم از کم دس منٹ تک وہ اسی طرح ہلتی رہی۔ مگر پھر ہم نے زیادہ دیر وہاں کھڑے رہنا مناسب نہ سمجھا اور چٹّان کو ہلتا چھوڑ کر پہاڑ سے نیچے اُترنے لگے اور کُچھ ہی دیر بعد ہر سمت کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے ہم واپس اپنے غار میں آ گئے۔

راستے ہی میں ہم نے کُچھ مرے ہوئے پرندے چُن کر اُٹھا لیے تھے اور جھاڑیوں میں سے آگ لے لی تھی۔ اس لیے غار میں پہنچنے کے بعد ہم نے

پرندے بھون کر کھائے۔ اتّفاق سے مُجھے کُچھ بھُنی ہوئی مچھلیاں زمین پر
پڑی ہوئی مل گئیں۔ میں نے مرے ہوئے پرندے نہیں کھائے بلکہ اِن
مچھلیوں کو کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ بھوک بے حد لگ رہی تھی اس لیے
دو منٹ ہی میں میرے تینوں ساتھیوں نے سولہ پرندوں کا صفایا کر ڈالا۔
غار کے باہر ہی ایک گڑھے میں پینے کا پانی بھرا ہوا تھا۔ یہ پانی کسی سوت
سے آ رہا تھا۔ اس کا اندازہ ہم پہلے ہی لگا چکے تھے اور ہم نے یہ پانی پیا
بھی تھا۔ اس لیے مچھلیاں اور پرندے کھانے کے بعد ہم نے خوب سیر ہو
کر پانی پیا۔ پانی گرم تو تھا مگر پیاس بُجھ گئی تھی۔ پانی پینے کے بعد جان نے
کہا۔

"اس مکّھی کو ختم کرنے کا ایک نرالا اور انوکھا طریقہ مُجھے سوجھ گیا ہے۔"

"کون سا طریقہ؟" سب نے ایک ساتھ پوچھا۔

”ہو سکتا ہے کہ خُدا نے میرے دِل میں یہ بات ڈالی ہو۔ اگر وہ طریقہ کارآمد ہوگیا تو ہم بغیر کسی محنت اور تکلیف کے اس خوف ناک مکھّی کو ختم کر سکتے ہیں۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ آج شام کو جو پرندے اس جزیرے کا رُخ کریں اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ وہ ضرور شام کو اس طرف کائی کھانے آئیں گے تو ہم انہیں اس جزیرے میں بسیرا نہ کرنے دیں اور کوشش کریں کہ وہ کائی نہ کھائیں۔۔۔۔“

”مگر یہ کس طرح مُمکن ہے!“ جیک نے تعجّب سے کہا۔ ”پرندے تو ہزاروں کی تعداد میں ہیں!“

”مُمکن تو ہے۔ ہمیں شام ہوتے ہیں درختوں کی لکڑیاں جمع کر کے اُن میں آگ لگا دینی چاہیے پرندے خواہ کتنی ہی تعداد میں ہوں مگر آگ دیکھ کر کوئی پرندہ بھی اِس طرف کا رُخ نہ کرے گا۔۔۔“ جان نے جواب دیا۔

”مگراِس کا فائدہ کیا ہوگا؟“میں نے پوچھا۔

”یہ میں اس وقت بتاؤں گا۔ فی الحال تو یوں سمجھو کہ میں ایک جُوا کھیل رہا ہوں۔ اگر جیت گیا تو واہ وا۔ ورنہ موت تو ہر حالت میں سامنے کھڑی دِکھائی دے رہی ہے۔۔۔“ جان نے سامنے کی طرف صاف میدان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی وقت ہے، اس لیے سب سے پہلے ایک کام اور کرنا ہے آؤ میں تمہیں بتاؤں۔“

اتنا کہہ کر وہ ہمیں اُس میدان میں لے گیا اور سب کو قطار میں کھڑے ہونے کو کہا۔ بعد میں خود بھی اسی قطار میں کھڑا ہوگیا۔ پھر کہنے لگا "ہمیں اس وقت دوڑ کا مُقابلہ کرنا ہے۔“

”کیا مطلب۔ آپ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے!“ جیک کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"مذاق نہیں جیک، میں سنجیدہ ہوں۔ یوں سمجھو کہ ہمارے پیچھے وہ خوفناک مکھّی آ رہی ہے اور ہمیں بھاگ کر اپنی جان بچانی ہے۔ کون ہم میں سے تیز دوڑ کر آگے بھاگ جاتا ہے، یہی دیکھنا ہے۔" سچ بات تو یہ ہے کہ مُجھے خود بھی یہ عجیب بات سن کر اتنی حیرت ہوئی کہ شاید کبھی نہ ہوئی ہو گی۔ کیا واقعی یہ مذاق کا موقع تھا! مگر جان کی شکل دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس معاملہ میں بالکل سنجیدہ ہے۔ ہم نے کُچھ کہنا چاہا مگر اس نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ اور آخر کار مجبوراً ہمیں یہ دوڑ کا مقابلہ کرنا ہی پڑا۔ ایک دو تین کہہ کر ہم چاروں بڑی تیزی سے سامنے کی طرف بھاگے اور پھر بھاگتے ہی چلے گئے جان تو بے چارہ جلد ہی تھک گیا۔ اس کے بعد ملّاح ہانپنے لگا۔ صرف میں اور جیک آگے بھاگتے گئے، مگر جیک میں اور مُجھ میں بڑا فرق تھا۔ مانا کہ وہ بہت طاقت ور تھا، مگر میرے مُقابلے میں تیز نہ بھاگ سکا اور پھر جلد

ہی مُجھ سے پیچھے رہ گیا۔ جان کی آواز سن کر ہم واپس آئے تو دیکھا کہ وہ بہت افسردہ بیٹھا ہوا ہے۔

"کیا بات ہے سر، کیا آپ کو میرے جیتنے کا رنج ہوا۔؟" میں نے آتے ہی پوچھا۔

"ہاں رنج ہوا ہے۔ فیروز! میں نہیں چاہتا تھا کہ تم اس دوڑ میں اوّل آتے مگر کیا کر سکتا ہوں، ہماری تقدیر!"

"آخر بات کیا ہے مسٹر جان، آپ معمّوں میں باتیں کیوں کر رہے ہیں؟" جیک نے پوچھا۔

"بات سُنانے کی نہیں۔ جب عمل کا وقت آئے گا تو تم میری دوراندیشی کے ضرور قائل ہو جاؤ گے۔ میں چاہوں تو تمہیں ابھی سب طریقہ سمجھا

دوں مگر اب وقت نہیں ہے، شام ہو رہی ہے اور ہمیں جلد از جلد اِس مُقام پر آگ جلا کر کہیں چھُپ جانا چاہیے۔ یہ تو ہم معلوم کر ہی چکے ہیں کہ مکھّی صرف اِسی مقام پر آتی ہے جہاں ہم کھڑے ہوئے ہیں اور جس کے آس پاس کی چٹّانوں پر وہ کائی جمی ہوئی ہے۔ اِس لیے آگ ہمیں تقریباً پچاس گز کے قطر میں جلانی پڑے گی۔"

"مگر اس طرح تو ہمارا وہ غار بھی لپیٹ میں آ جائے گا جہاں ہم رات بسر کریں گے۔" جیک بولا۔

"یقیناً ایسا ہو گا۔" جان نے جواب دیا۔ "مگر ہم آج رات وہاں سوئیں گے ہی نہیں بلکہ اس پہاڑ کی چوٹی پر آرام کریں گے، جس کے اوپر وہ ہلتی ہوئی چٹّان رکھی ہے۔ ہم آج غار میں پناہ نہ لیں ہمارے حق میں یہی بہتر ہے۔ اگر خُدا کو منظور ہوا تو کل دِن میں ہم اس خوف ناک مکھّی سے نجات حاصل

کرلیں گے۔"

"یہ تو سب سے اچھّی بات ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہم اس جزیرے سے جلد سے جلد نکل جائیں گے۔" جیک نے کہا۔

"اِس غلَط فہمی میں مت رہو جیک۔" جان نے کہا۔ "ہمیں پورے تیرہ دِن یہاں اور گزارنے پڑیں گے۔ جزیرے کے ڈوبنے کا انتظار ہر حال میں کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ اس کے ڈوبنے کے بعد ہی ہمارا جہاز واپس پانی کی سطح سے لگ سکتا ہے۔"

قدم قدم پر مُشکلات کھڑی تھیں۔ آفتوں اور مُصیبتوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ خُدا ہی بہتر جانتا تھا کہ ہمارا کیا حشر ہونے والا تھا۔ عقل کام نہ کرتی تھی اور نہ جانے کیوں ایک گھبراہٹ سی ہر شخص پر حاوی تھی، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی جو ایک کہہ دیتا تھا وہ سب مان

لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے جان کا کہنا مان لیا تھا! مختصر یہ کہ جلدی جلدی ہم نے مل کر لکڑیاں کاٹیں۔ گھاس پھوس اکٹھا کیا۔ ہر چیز گیلی تھی اس لیے بڑی مُصیبتوں کے بعد ہم نے آگ جلائی اور پھر اس آگ کو دور دور پھیلا دیا تاکہ شام کو ہر سمت دھواں ہی دھواں بھر جائے۔ خُدا کا شکر ہے کہ ہماری محنت اکارت نہ گئی۔ آگ جل گئی اور لپٹیں اُٹھنے لگیں۔ ادھر سورج نے بھی سمندر میں اپنا مُونہہ چھپانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر جان نے کہا۔

"اپنا سامان اٹھا کر اب اس پہاڑ کی طرف چلو۔"

جان کا حُکم مان کر ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور پھر احتیاط سے ہر طرف دیکھتے بھالتے اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے، جہاں وہ دوسرا ہلتا ہوا چھوٹا پہاڑ ٹِکا ہوا تھا۔ یہاں اتنی جگہ ضرور تھی کہ ہم دیوزاد اور خوف ناک مکّھی کی نظر

سے چھُپ کر آرام کر سکتے تھے۔ ابھی ہم نے وہاں اپنا سامان رکھا ہی تھا کہ جان نے مُجھ سے کہا کہ میں اس مقام کو دیکھوں جہاں ہماری لگائی ہوئی آگ بھڑک رہی ہے۔

پرندے اب آہستہ آہستہ ہر سمت سے اِس جزیرے میں کائی کھانے کے لیے آ رہے تھے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ شاید سورج ڈوبنے کے بعد ہی اِس کائی کی مہک ہوا کے ذریعے ہر طرف پھیلتی ہو گی اِسی لیے پرندے شام کو آتے تھے! جزیرے کی طرف آتے ہی وہ آگ دیکھ کر اوپر پھڑپھڑاتے رہے۔ مگر نیچے اُترنے کی ہمّت کسی میں نہ ہوئی۔ سورج ڈوبتا جا رہا تھا اور پرندے برابر آتے جا رہے تھے۔ مگر اُن میں سے ایک پرندہ بھی نیچے نہیں اُترتا تھا۔ آخر کار رات ہو گئی۔ پرندے واپس لوٹنے لگے۔ مگر ان کی بے قراری بڑھتی ہی گئی۔ واپس جاتے ہوئے انھوں نے اتنا

شور کیا کہ پورا جزیرہ گونج گیا۔ کُچھ دیر بعد جان نے دُوربین لگا کر دیکھا اور ہمیں بتایا کہ اب آسمان پر ایک بھی پرندہ نہیں ہے!

"اب کیا ہو گا؟" میں نے جان سے دریافت کیا۔

"اب یہ ہو گا فیروزکہ۔" جان نے سب کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہ رات ہم اِسی چوٹی پر بسر کریں گے، مگر صُبح کے چار بجے جاگ جائیں گے اور تب ہم اِس خوف ناک مکھّی کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کیوں کہ اپنا شکار کھانے کے لیے وہ ضرور اپنے گھر میں سے نکل کر اِن پہاڑوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی اِس مقام تک جائے گی جہاں آگ جل رہی ہے۔ شکار نہ پا کر وہ بہت بے چین ہو گی اور پورے جزیرے میں ماری ماری پھرے گی۔ آخر تنگ آ کر وہ واپس اپنے غار میں جانے کی کوشش کرے گی اور تب ہی ہم اسے مار ڈالیں گے۔"

"مگر کس طرح مار ڈالیں گے؟" جیک نے پوچھا۔

"پہلے میں مکّھی دیکھ لوں۔ مارنے کا طریقہ پھر بتاؤں گا۔ وقت سے پہلے میں اِس لیے کُچھ کہنا نہیں چاہتا کہ مُمکن ہے میرا سوچا ہوا غَلط ثابت ہو جائے۔"

رات ہم نے اِسی چوٹی پر بسر کی اور پھر شاید صُبح کے چار بجے ہی کا وقت تھا کہ جان نے ہم سب کو جگا دیا اور اشارے سے کہا ہم بالکل چُپ رہیں اور اس غار کو دیکھیں جہاں مکّھی کا گھر ہے۔ ہم آنکھیں ملتے ہوئے اس مقام کی طرف دیکھنے لگے جہاں مکّھی کا گھر تھا اور جہاں اب ہلکی سی روشنی ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ روشنی بڑھنے لگی۔ اور پھر بڑھتے بڑھتے اتنی تیز ہو گئی کہ ہمیں چندھیا کر اُس طرف دیکھنا پڑا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اچانک ایک تیز شعلہ آسمان کی طرف لپکا۔ اور پھر وہی ریل کے انجن جیسی تیز سیٹی سُنائی

دی۔ بڑی تیز گڑگڑاہٹ کی خوف ناک آواز آنے لگی۔ غار میں سے بار بار وہی شعلہ سا باہر لپکنے لگا۔ ہمارے دِلوں کا اِس وقت بس خُدا ہی حافظ تھا۔ ہمارے اِس سفر کا سب سے بڑا خطرہ اب ہمارے سامنے تھا۔ جو کُچھ بھی ہماری قسمت کا لکھا تھا، بس اب چند سیکنڈ کے اندر ہی اندر ہو جانے والا تھا!

شعلہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد غار سے باہر لپکتا تھا۔ ساتھ ہی اوپر کا حصّہ روشن ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی آتش فشاں پھٹنے والا ہے۔ ہم آنکھیں پھاڑے حیرت سے اس مقام کو دیکھے جا رہے تھے اور پھر ہمارے دیکھتے دیکھتے ہاتھی کے پیروں سے بھی موٹے دو پیر اس غار سے باہر آئے۔۔۔

روشنی اتنی تیز تھی کہ ہم ایک ایک چیز صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔ پیروں

کے بعد ایک لمبی سی سونڈ دکھائی دی، اسی سونڈ میں سے وہ تیز شعلہ بار بار نکل رہا تھا۔ شعلہ اندازاً اُس کی ناک سے پندرہ گز دور تک پہنچتا تھا۔ اس خطرناک مکّھی کے پیر آگے جا کر ایک پنجہ سا بن جاتے تھے۔۔۔ بالکل کبوتر کے پیروں کی طرح اور اپنے اسی پنجے کو دلدلی زمین میں گاڑتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ اوپر آ رہی تھی۔ جلد ہی ہمیں اس کا سر بھی نظر آ گیا، کیا بتاؤں کہ یہ سر کتنا بڑا تھا! دہلی کی جامع مسجد کے پہلو والے گنبد سے بس ذرا سا ہی چھوٹا ہو گا۔ اس سر میں اس کی دو لمبوتری آنکھیں خون کی طرح سُرخ نظر آتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آنکھوں کی جگہ دو بڑے انگارے جڑے ہوئے ہوں۔ ہم لوگ چٹّان کی اوٹ میں دُبکے ہوئے خاموشی سے اُسے دیکھ رہے تھے اور اب وہ پوری طرح غار سے باہر آ چکی تھی!

اس کا جسم بہت لمبا تھا۔ خیال تو یہ تھا کہ ہاتھی سے بڑی ہو گی، مگر اب جب

آنکھوں سے دیکھا تو حقیقت کھلی وہ دراصل وھیل مچھلی سے بھی لمبی تھی۔
اس کے جسم میں آگ دہک رہی تھی، کیوں کہ جسم بالکل سُرخ تھا۔ خُدا کی
قدرت کی کیا تعریف کی جائے! کیسے کیسے جانور اُس نے دُنیا میں پیدا کر
دیے ہیں! غار سے باہر آنے کے بعد مکّھی نے وہی تیز سیٹی جیسی آواز
نکالنی شروع کر دی اور کُچھ دیر کے لیے آرام کرنے لگی۔ آپ نے ہوائی
اڈّے پر کسی ہوائی جہاز کو اڑنے سے پہلے ضرور دیکھا ہو گا۔ وہ پہلے ایک
جگہ کھڑا رہ کر سیٹی کی سی آواز نکالتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اُڑتا
ہے۔ یہی حال اس مکّھی کا تھا مگر ہمیں ابھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ اُڑتی
بھی ہے یا نہیں۔ اس کے دو بہت بڑے پَر نظر تو آ رہے تھے۔ مگر ابھی
تک ہم نے اُسے اِن پَروں سے کام لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اچانک
کُچھ دیر بعد اس میں حرکت ہوئی۔ سیٹی کی آواز اور تیز ہو گئی اور پھر اس کے

دونوں بڑے پَر تیزی سے ہلنے لگے۔ پَروں کے ہلنے کے ساتھ ہی آس پاس کے درخت بُری طرح لرزنے لگے، مٹّی اُڑنے لگی، ایسا لگتا تھا جیسے طوفان آگیا ہو۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ ہوامیں بُلند ہو کر اُڑنے لگی۔ مگر وہ زیادہ اونچی نہیں اُڑ رہی تھی۔ مُشکل سے زمین سے کوئی پانچ گز اونچی ہو گی اور بس۔

یہ دیکھ کر ہم نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ ہم جس پہاڑ پر کھڑے ہوئے تھے وہ کافی اونچا تھا۔ اگر نیچا ہوتا تو ہم مکھّی کی تیز نظروں سے ہر گز نہ بچ سکتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ اُڑتی ہوئی ان دو پہاڑوں ہی کی طرف آرہی تھی۔ جلدی سے ہم پہاڑ کی چوٹی پر ٹکی ہوئی چٹان کے نیچے دُبک گئے اور اور مکھّی دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی اس طرف جانے لگی جہاں ہم نے آگ لگائی تھی۔ مکھّی کے اس طرف جاتے ہی جان نے گھبرا کر کہا۔

"بس اب عمل کا وقت آگیا ہے۔ وہ دوڑ کا مقابلہ میں نے اسی وقت کے لیے کرایا تھا۔ بد قسمتی سے فیروز اس مُقابلے میں اوّل آیا تھا۔ مگر فیروز کو موت کے مُونہہ میں جھونکنا مُجھے پسند نہیں۔ وہ بچّہ ہے، اسے زندگی گزارنی ہے۔ مگر میں نے اپنی زندگی کے دِن پورے کر لیے ہیں، اس لیے میں ہی اب پہاڑ سے نیچے جاتا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ یعنی اس کا مطلب کیا ہے۔۔۔؟" میں نے تعجّب سے پوچھا۔

"مطلب۔۔۔ ہاں مطلب بھی مُجھے ضرور بتانا چاہیئے۔" جان نے کہنا شروع کیا۔ "دیکھو فیروز۔ میں نے دراصل یہ سوچا ہے کہ مکھّی جہاں اس وقت گئی ہے وہاں اسے کوئی پرندہ نظر نہ آئے گا۔ وہ بھوکی ہوگی اس لیے سب جگہ کی خاک چھاننے کے بعد مجبوراً وہ واپس اپنے غار میں چلی جائے

گی۔ اِس مکھّی کی خاصیّت ہے کہ وہ زیادہ دیر تک سمندر سے اوپر نہیں رہ سکتی۔۔۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ میں پہلے پہاڑ کے نیچے اُتر کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ ان دونوں پہاڑوں سے کم از کم چالیس گز دور کھڑے ہونے سے یہ فائدہ ہو گا کہ مکھّی کے غار سے بھی قریب رہوں گا اور سمندر سے بھی۔ پہاڑ سے نیچے اُس کے سامنے کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے مکھّی پہاڑوں کے درمیان سے نہ گُزرے تو مُجھے دیکھ کر لازمی طور سے وہ پہاڑوں کے بیچ میں سے گزرے گی۔ اب غور سے سُنو کہ کرنا کیا ہے۔ مکھّی جب اپنے غار یا گھر کی طرف واپس آ رہی ہو گی تو لازمی تھکی ہوئی ہو گی۔ اِس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ یا تو زمین پر گھسٹتی ہوئی چلے یا زمین سے بہت ہی تھوڑے فاصلے پر اڑے۔ تم لوگوں کا کام یہ ہو گا کہ پہاڑ کی ٹکی ہوئی اس بڑی چٹّان کو زور سے ہلانا شروع کر دو۔ اور کوشش یہ کرو کہ

جیسے ہی وہ مکھّی مُجھے دیکھ پہاڑوں کے درمیان آجائے یہ چٹّان اس کے جسم پر جا کر گرے۔ میرے خیال میں یہی طریقہ اُسے ختم کرنے کا ہو سکتا ہے۔

یہ سُنتے ہی میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ کیوں کہ اس میں تو خطرہ ہی خطرہ تھا!

"لیکن اگر ہمارا نشانہ خطا ہو گیا تو؟" جیک نے جلدی سے کہا۔ "مطلب یہ کہ چٹّان مکھّی پر نہ گری تو؟"

"تو یہ کہ میں تیز دوڑتا ہوا سمندر میں جا کر گھُس جاؤں گا اور تیرتا ہوا اُس طرف نکل آؤں گا جہاں ہم نے آگ لگائی ہے۔" جان نے جواب دیا۔

"مگر آپ تیز کس طرح دوڑیں گے؟ آپ تو مُقابلہ میں پہلے ہی دم توڑ چکے

تھے!" جیک نے کہا۔ "نہیں مسٹر جان یہ کام میں کروں گا، میں نیچے جاتا ہوں۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے چلّا کر کہا۔ "انصاف سے کام لیجیے۔ دوڑ میں اوّل میں آیا تھا، اس لیے یہ معرکہ بھی مُجھے ہی سر کرنا ضروری ہے، پھر دوسری بات یہ کہ چٹّان آپ تینوں مل کر جلدی ہلا سکیں گے۔ میں ہوں گا تو اِس میں وقت لگے گا کیونکہ میں عُمر میں کم ہوں اور کم طاقت ور ہوں اس لیے اب میں نیچے جاتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ جان اور جیک مُجھے روکتے، میں تیزی سے پہاڑ کی ڈھلان کی طرف بھاگا۔ انہوں نے مُجھے بہتیری آوازیں دیں۔ مگر میں نے کسی کی ایک نہ سُنی اور نیچے اُترتے اُترتے پکار کر کہا۔

"مُجھے مت روکیے سر۔ بحث میں وقت صرف ہوگا، ایسا نہ ہو کہ وہ مکّھی

واپس آجائے۔"

یہ کہہ کر میں جلدی جلدی پہاڑ سے نیچے اُترنے لگا اور پھر کُچھ ہی دیر بعد میں ان دونوں پہاڑوں سے چالیس گز کی دوری پر کھڑا تھا۔ مُجھے وہاں دیکھ کر مجبوراً جان، جیک اور ملّاح اُس ہلتی ہوئی چٹّان پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ طوفان بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ سیٹی تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بڑی ہیبت ناک آوازیں آرہی تھیں۔ خوف کے مارے میرا رُواں رُواں لرز رہا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ میری کیا حالت تھی، پسینے چھوٹے ہوئے تھے اور جسم کپکپا رہا تھا۔ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر عین وقت پر چٹّان مکّھی کے جسم پر نہ گِری تو میرا خاتمہ یقینی ہے۔ مکّھی پندرہ گز دور ہی سے مُجھے جلا کر خاک کر ڈالے گی۔ یہ سوچتے ہی میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان کی طرف نظر کرتے ہی میرے آنسو بہنے لگے اور

میں بے اختیّار سجدے میں گر گیا۔ میرا دِل خُدا تعالیٰ سے خاموش دُعا مانگ

رہا تھا۔ میں نے ایک لفظ مُونہہ سے نہ نکالا، مگر دِل دُعا مانگتا رہا آنسو بہتے

رہے اور پھر اچانک یوں لگا کہ میرا جسم کپکپانا بند ہو گیا ہے۔ دِل میں نہ

جانے کہاں سے طاقت آ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس وقت اگر سامنے سے

ہاتھی بھی آ جائے تو اُسے چٹکی سے مسل کر رکھ دوں گا۔! اچانک دھب

دھب کی تیز آواز مُجھے سُنائی دی۔ ساتھ ہی ایسا دھماکا بھی سُنائی دیا جس کی

وجہ سے زمین لرزنے لگی۔۔۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا، کیونکہ سامنے دو

پہاڑوں کے بیچ میں سے مُجھے وہ خوف ناک مکّھی زمین پر چلتی ہوئی اپنی

طرف آتی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے پہاڑ کی چوٹی پر نظر اٹھا کر دیکھا تو

جان نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ہوشیار! اور پھر وہ تینوں مل کر چٹّان کو ہلانے

لگے۔ مکّھی ویسے تو آہستہ چل رہی تھی، لیکن کبھی کبھی چلتے چلتے پھُدک کر

آ گے بڑھ آتی تھی۔ چٹّان برابر تیزی سے ہل رہی تھی۔۔۔ مکّھی قریب آتی جارہی تھی اور میں نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے، چُپ چاپ کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا اور پھر وہی ہوا جو جان نے کہا تھا۔ مکّھی نے مُجھے دیکھ کر زور کی پھُنکار ماری اور میری طرف تیزی سے بڑھنے لگی۔ میں سینہ تانے اُسے گھور رہا تھا۔ چٹّان اور زور زور سے ہل رہی تھی۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ مکّھی جیسے ہی پہاڑوں کے بیچ میں پہنچی، اوپر سے چٹّان لڑھک کر اُس کی طرف گِرنے لگی اور مکّھی زور سے پھُدک کر میری طرف آئی اور پھر۔۔۔ پھر مُجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا؟ دہشت کی وجہ سے میں بے ہوش ہو کر زمیں پر گر گیا۔۔۔

جب مُجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں اپنے بادبانی جہاز کے ڈیک پر چِت لیٹا ہوا ہوں۔ چمکیلی دھوپ نکل رہی ہے۔ ہر طرف سکون سا ہے

اور جان مُجھ پر جھُکا ہوا غور سے مُجھے دیکھ رہا ہے، مُجھے ہوش میں آتے دیکھ کر اُس نے خُدا کا شکر ادا کیا اور پھر جیک کو آواز دی۔ جیک اندر کیبن میں سے دوڑتا ہوا آیا اور میرے قریب بیٹھ کر میرے سر کو سہلانے لگا اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ جب اس نے میرے سر کو سہلایا تو مُجھے محسوس ہوا کہ میرے سر میں پٹّی بندھی ہوئی ہے اور سر میں ہلکی سی تکلیف بھی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ اندازہ لگا کر میں نے بڑی کمزور آواز میں پوچھا۔

"میرے سر پر پٹّی کیوں بندھی ہوئی ہے۔۔۔ مُجھے کیا ہوا؟"

"گھبراؤ مت فیروز۔" جان نے میرا سر تھپتھپا کر جواب دیا۔ "اب تُم بالکل ٹھیک ہو۔ بات یہ ہے کہ تُم گِر گئے تھے اور تمہارا سر ایک پتھرّ سے ٹکرایا تھا۔ گِرتے ہی تم بے ہوش بھی ہو گئے تھے اور پورے تیس گھنٹے تک

بے ہوش رہے۔ آج تُم ہوش میں آئے ہو، خُدا کا شکر ہے کہ اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمھارے دماغ کو گرمی پہنچانے کی ضرورت تھی اس لیے ہم نے تمھیں دھوپ میں لِٹا رکھا ہے۔"

"اوہ! یہ بات ہے۔" میں نے کمزور آواز میں کہا۔ اچانک مُجھے وہ دیو زاد مکّھی یاد آ گئی۔ خوف کے باعث میرا جسم لرزنے لگا اور میں خوف زدہ آواز میں چلّایا۔ "مکّھی۔ وہ مکّھی کہاں ہے؟"

جیک نے جان کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا۔ "فیروزا اپنے دماغ پر زور مت ڈالو۔ فی الحال اتنا سمجھ لو کہ تُم مکّھی کے حملے سے بچ گئے ہو۔ جب تُم بالکل تندرست ہو جاؤ گے تو ہم تمھیں ایک ایک بات بتا دیں گے۔"

میں چوں کہ سب حال جاننے کے لیے بہت بے تاب تھا اس لیے میں

نے جلدی سے کہا۔ "نہیں نہیں اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ خُدا کے لیے مُجھے سب کُچھ بتائیے آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ جزیرہ کہاں گیا۔ وہ مکّھی کیا ہوئی اور اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

جان نے جواب دیا۔ "اچھّا تو پھر تم اندر چل کر لیٹ جاؤ۔ ہلو جلو مت اور بولو بھی کم۔ تب میں تمھیں پوری باتیں سُناؤں گا۔"

میں نے اُس کی بات مانتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کی۔ ان دونوں نے مُجھے سہارا دیا اور پھر اندر کیبن میں لے جا کر میرے بستر پر لِٹا دیا۔ اِس کے بعد جان نے اپنا پائپ سلگایا اور دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"باتیں بڑی عجیب ہیں فیروز! مختصراً تمھیں بتاتا ہوں۔ جب تُم ہمارا کہنا نہ مانتے ہوئے پہاڑ سے نیچے اُترنے لگے تو مُجھے بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ پہاڑ پر

کائی جمی ہوئی تھی اور ہر لمحہ تمہارے نیچے پھسل جانے کا خطرہ تھا، مگر اس سے بھی بڑا خطرہ وہ تھا جس سے مُقابلہ کرنے کے لیے تُم نیچے جا رہے تھے۔ ہمارے دِلوں کی عجیب حالت تھی۔ ہمارے سامنے تُم موت کے مُونہہ میں جا رہے تھے اور ہم کُچھ نہ کر سکتے تھے، اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ ہم تمھیں زبردستی اوپر کھینچ کر لاتے۔ مکّھی آہستہ آہستہ پہاڑ کی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ میں دِل ہی دِل میں خود کو ملامت کر رہا تھا کہ بڑا بہادر ہوں! خود تو جان بچا کر پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں اور ایک چھوٹا سا لڑکا موت سے ٹکر لینے نیچے جا رہا ہے۔ مگر وقت اتنا نازک تھا کہ سوچنے سمجھنے کی نہیں بلکہ عمل کی ضرورت تھی۔ آخر مجبور ہو کر ہم عمل کے لیے تیّار ہو گئے۔ جب ہم نے دیکھا کہ تم پہاڑوں سے کافی دور جا کر مکّھی کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے ہو، تو ہم تینوں نے اِس چٹّان کو ہلانا شروع کر دیا۔۔۔ جو چٹّان

انگلی لگانے سے ہلنے لگی تھی وہ اب ہم تینوں کے زور لگانے سے بُری طرح ہلنے لگی۔ مکّھی پھنکاریں مارتی ہوئی تمھاری طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ چوں کہ وہ بہت زیادہ تھکی ہوئی اور شاید بھُوکی بھی تھی۔ اِس لیے ہوا میں اُڑ نہیں سکتی تھی۔ اگر خُدا نخواستہ اُڑنے لگتی تو پھر ہمارا خُدا ہی حافظ تھا۔ اُس نے صرف تمھیں ہی دیکھا تھا اس لیے تمھاری ہی طرف بڑھنے لگی۔ ہم لوگوں کے ہاتھ پاؤں کا دم سا نکل رہا تھا۔۔۔ سوچ رہے تھے کہ اگر چٹّان بَروقت اُس پر جا کر نہ گِری تو ہم تم سے ہاتھ دھو لیں گے۔ کیوں کہ مکّھی کے قریب آ جانے کے بعد تُم تیزی سے سمندر کی طرف نہیں بھاگ سکتے تھے لہٰذا مکّھی اپنے شکار کو بھاگتے دیکھ کر ایک زور دار حملہ ضرور کرتی۔ خیر ہم چٹّان کو ہلاتے رہے اور جب وہ دیوزاد مکّھی دونوں پہاڑوں کے درمیان میں پہنچ گئی۔ تو ہم نے چٹّان زور لگا کر گِرا دی۔ ہماری خوش

قسمتی تھی اور خُدا کا کرم کہ چٹّان بالکل اُس کے پیٹ پر جا کر گِری۔ بڑے زور کے چھپاکے اُڑے۔ اور اُس کے پیٹ میں سے گرم گرم لاوا نکل کر ہر طرف بہنے لگا۔ جس طرف بھی لاوا گیا، اس نے ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی چٹّانیں تو اس لاوے میں اِس طرح پگھل گئیں، جیسے چینی پانی میں گھُل جاتی ہے۔ مکّھی مر رہی تھی اور وہ اپنی دم زور زور سے زمین پر پٹخ رہی تھی۔ اُس کی ناک سے نکلنے والے شُعلے اب مدہم ہوتے جا رہے تھے اور لاوا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہم نے تمھیں بے ہوش ہو کر زمین پر گِرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور اب ہمیں یہ خدشہ ہونے لگا تھا کہ لاوا کہیں بڑھتے بڑھتے تم تک نہ پہنچ جائے! سچ بات تو یہ ہے کہ اِس موقع پر میں ملّاح کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر تیزی سے پہاڑ کے نیچے اُترنے لگا۔ جب وہ پہاڑ کے نیچے پہنچ گیا تو ہم نے دیکھا کہ لاوا آہستہ

آہستہ پہاڑ کو چاروں طرف سے گھیر رہا ہے۔ مگر اِس سے پہلے کہ لاوا پہاڑ کو گھیرتا، ملّاح ایک چھلانگ لگا کر لاوے کے اوپر سے گُزر گیا اور پھر چٹّانوں کی آڑ لیتا ہوا دوڑ کر تُم تک پہنچ گیا۔ لاوا آہستہ آہستہ تمہاری طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے تمہیں اُٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور دوڑتا ہوا اُس طرف پہنچنے کی کوشش کرنے لگا جہاں لاوا ابھی تک نہیں آیا تھا۔ تمہیں لاوے سے بچاتا ہوا آخر کار وہ وہاں پہنچ گیا جہاں ہم نے پہلے پہل ایک غار میں رات گزاری تھی۔ لاوا اس مقام تک کسی صورت سے بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

"اور آپ پہاڑ سے کس طرح نیچے اُترے؟" میں نے ایک ٹھنڈا سانس لینے کے بعد پوچھا۔

"ہم دونوں پہاڑ پر کھڑے مکھّی کو اپنا سر زمین پر پٹختے دیکھتے رہے۔ سورج

پوری طرح آسمان پر نکل کر چمک رہا تھا اور ہم کھڑے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں؟ کوئی چھ گھنٹے اسی طرح کھڑے کھڑے گزر گئے۔ آخر کار کافی دیر کے بعد ہمیں ملّاح کی شکل دِکھائی دی۔ وہ اپنے ساتھ موٹے موٹے رسّے لیے ہوئے آ رہا تھا۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ ملّاح لازمی طور پر اپنے جہاز میں پہنچا ہو گا اور وہیں سے یہ رسّے نکال کر لایا ہو گا۔ اُس نے ہمیں نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ جب ہم پہاڑ کے نیچے پہنچ گئے تو ہم نے دیکھا کہ کسی صورت سے بھی ہم زمین پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ لاوے نے پہاڑ کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا اور اس میں سے بُلبُلے اور بھاپ اُٹھ رہی تھی! یہ دیکھ کر ملّاح نے دور سے چلّا کر کہا کہ وہ رسّہ ہماری طرف پھینکتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ رسّے کا ایک سِرا پہاڑ پر اُگے کسی درخت سے باندھ دیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا اور ملّاح نے بھی رسّے کا دوسرا سِرا پہاڑ

سے کافی فاصلے پر اُگے ہوئے ایک دوسرے درخت سے باندھ دیا۔ اِس کے بعد اُس نے ہم سے کہا کہ رسّے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر لٹکتے ہوئے ہم آگ کا یہ دریا پار کریں۔

آخر ہمیں اُس کا کہنا ماننا ہی پڑا کیوں کہ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ بھی نہیں تھا۔ ہمارے نیچے گرم گرم لاوا اُبل رہا تھا اور ہم اس کے اوپر رسّے سے لٹکتے ہوئے گُزر رہے تھے۔ مختصر یہ کہ ملّاح کی عقل مندی سے ہم نے اُس لاوے کے دریا سے نجات پائی۔ ملّاح کے پاس پہنچے تو اُس نے مُجھ سے کہا کہ وہ تمہیں جہاز کے اندر کیبن میں چھوڑ آیا ہے۔ غار اُسے محفوظ معلوم نہیں ہوا ساتھ ہی وہ مکھّی کا سر کاٹنے کے لیے کلہاڑا بھی لیتا آیا ہے۔ جب میں نے اُس سے پوچھا کہ مکھّی کا گُنبد نما سر کس طرح کٹے گا جب کہ لاوا اُس کے چاروں طرف کھَول رہا تھا؟ تو اُس نے ایک بڑی اچھّی

ترکیب بتائی۔ اُس نے کہا کہ وہ دوسرے رسّے کا ایک پھندا سا بنائے گا۔ پہلا رسہ تو دونوں درختوں سے بندھا ہوا تھا اور وہ کسی صورت سے نہیں کھُل سکتا تھا۔ کیوں کہ اُسے کھولنے کے لیے ہمیں پھر پہاڑ پر جانا پڑتا۔ اِس لیے اِس دوسرے رسّے کا پھندا دُور کھڑے کھڑے وہ مکّھی کے سر کی طرف پھینکے گا۔ پھندا اگر مکّھی کے سر پر اُٹھے ہوئے دو سینگوں میں جا کر پھنس گیا تو وہ ہم دونوں کی مدد سے زور لگا کر مکّھی کو اپنی طرف کھینچ لے گا۔

۔۔۔ ترکیب عمدہ تھی اس لیے ہم نے اس پر فوراً عمل کیا اور نتیجہ کے طور پر ہم نے مکّھی کا سر اپنی طرف کھینچ لیا۔ جب سر ہمارے قریب آگیا تو ہم نے اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ آنکھیں کیا تھیں، دو بہت بڑے بڑے گول نگینے سے تھے اور اِن نگینوں میں ہزاروں رنگ نظر آتے تھے،

کسی طرف سے بھی دیکھنے کے بعد یہ رنگ پلٹنے لگتے تھے۔ بڑی دیر تک ہم ان شیشوں کو حیرت سے دیکھتے رہے اور پھر ملّاح نے ایک تیز خنجر سے وہ قیمتی آنکھیں سر میں سے نکال لیں۔ ان آنکھوں کو حفاظت سے اپنے ساتھ لے کر ہم جلدی جلدی آگے بڑھے۔

ملّاح پانی کے اُس ذخیرے کے قریب رُک گیا جو پہلے ہمیں گرم لگا تھا مگر پینے کے لائق تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ وہ کیوں رُک گیا ہے تو اُس نے کہا کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم جہاز میں سے پانی کے ڈرم لے کر آئیں تاکہ پینے کا پانی یہاں سے جمع کر سکیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے فیروز، کہ جس ملّاح پر ہم پہلے حُکم چلایا کرتے تھے، اب وہی خود ہم پر حُکم چلا رہا تھا اور ہم بغیر چوں چرا کیے اُس کی ہر بات مان رہے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمارا محسن تھا اور اس نے کُچھ دیر پہلے ہماری جانیں بچائی تھیں۔

خیر ہم جلدی جلدی پہاڑ پر چڑھے، جہاز میں سے دو ڈرم نکالے۔ میں نے جھانک کر تمہیں دیکھا، تم اس وقت تک بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ یہ سمجھ کر کہ تم جلد ہوش میں نہ آؤ گے، ہم ڈرمز لے کر پہاڑ سے نیچے آئے، ملّاح نے ڈرمز میں پانی بھرا اور پھر ایک ڈرم اپنے کندھے پر رکھ کر وہ پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ قصّہ مُختصر یہ کہ اِس طرح ہم نے زیادہ سے زیادہ ڈرم پانی سے بھر لیے۔ جس وقت ملّاح آخری ڈرم لے کر پہاڑ پر چڑھ رہا تھا، یکایک زمین زور سے ہلی اور نہ جانے کیا بات ہوئی کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے اچانک جزیرہ ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ پہاڑ پر چڑھتے چڑھتے ہم نے غور سے جزیرے کی زمین کو دیکھا تو بہت اچنبھا ہوا۔ بپھرتے ہوئے سمندر کا پانی آہستہ آہستہ زمین کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مطلب یہ کہ جزیرہ ڈوب رہا تھا!"

"وقت سے پہلے ہی ڈوب رہا تھا؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"ہاں فیروز! وقت سے پہلے ہی، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ سب اُس خوف ناک مکھّی کے اچانک مر جانے سے ہوا تھا۔" جان نے تمبا کو کے لمبے کش لگانے کے بعد کہا۔

"جب جزیرہ سمندر میں ڈوبنے لگا تو اُس کے ساتھ ہی ہمارا جہاز بھی آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ جہاز ابھی تک پہاڑ کی چوٹی پر ٹکا ہوا تھا۔ جب یہ پہاڑ بھی سمندر میں ڈوب گیا تو ہمارا جہاز بھی آپ ہی آپ پانی کی سطح سے لگ گیا۔ ہم تینوں نے مل کر جلدی جلدی بادبان کھولے اور لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے جہاز کو پہاڑ کی چوٹی سے دور ہٹا دیا۔ ہم چوٹی سے بانس لگا کر زور لگاتے اور جہاز اپنی جگہ سے تھوڑا کِھسک جاتا اور آخر کار اس طریقے سے جہاز چوٹی سے ہٹ کر پورا کا پورا پانی میں آ گیا۔۔۔ کوشش ہم نے یہی کی کہ جلد سے جلد اس موت کے جزیرے سے دور چلے جائیں اور اس میں

کامیاب بھی ہو گئے۔ راستے میں ہم نے تمھاری مرہم پٹّی کی اور اگلے دِن سورج کی پہلی کرن کو مکھّی کی آنکھوں سے گزار کر یہ سونا اور ہیرے بنائے۔ لو یہ دیکھو۔“

اتنا کہہ کر جان نے مُجھے چند ہیرے اور سونے کا ایک ٹکڑا دِکھایا۔ اس نے بتایا کہ ہیرے تو چند چھوٹے پتھرّوں سے بنے ہیں اور سونا ایک ٹوٹے ہوئے چاقو کے پھل سے۔ یہ چیزیں دیکھ کر میری حیرت کی کُچھ حد نہ رہی۔ اب تک تو میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ مکھّی کی آنکھوں والی کہانی میں کُچھ سچّائی نہیں ہے۔ ولیم نے کتاب میں جو کُچھ لکھا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے، مگر حقیقت میرے سامنے تھی اور اب میں اسے کسی بھی طرح نہیں جھٹلا سکتا تھا۔

آپ کو یہ بتانا تو اب بالکل بے کار سا لگتا ہے کہ ہم لوگ کس طرح

ہندوستان کے ساحل کومورن تک پہنچے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہزاروں مشکلیں جھیلتے، طوفانوں سے لڑتے، نِت نئی بلاؤں کا مُقابلہ کرتے آخر کار دس ماہ بعد کومورن پر اُترے۔ تب ہمیں اتنی خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کپڑے اتنے پھٹے ہوئے تھے کہ ہم اِس حالت میں بستی کے اندر نہیں جا سکتے تھے۔ مجبوراً ملّاح کو بھیجا۔ وہ ہمارے لیے سونے کی ایک چھوٹی سی ڈلی کے بدلے ایسا لباس لے آیا ہے جسے پہن کر ہم انسان نظر آنے لگے (یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ سونے کی ڈلی دراصل مکھّی کی آنکھوں ہی کا کرشمہ تھی)۔

چند دِن اُسی بستی میں آرام کرنے کے بعد ہم نے اپنے گھوڑے لیے اور ساتھ ہی بستی سے چند بڑے بڑے مضبوط تھیلے بھی خرید لیے، اِس کے بعد ہم اس مقام کی طرف روانہ ہوئے جہاں اب سے کافی دِن پہلے خزانہ

دریافت کیا تھا۔ چوں کہ اب ہم تازہ دم تھے اس لیے جلد ہی اُس خوف ناک جنگل میں داخل ہو گئے۔ جہاں دوبارہ داخل ہونے کی تمنّا ہم میں سے کسی کو نہ تھی۔ کیونکہ اِس جنگل میں ہمارے ساتھ بڑے عجیب حادثے پیش آ چکے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو یہ لکھتے ہوئے میرا دِل اب بھی کانپ رہا ہے کہ خزانے کے زمین دوز دروازے کے اوپر ہی ایک انسانی ڈھانچہ مُونہہ کھولے، بڑی بے بسی کی حالت میں پڑا ہوا ملا اور وہ ڈھانچہ عبدل کے سوائے اور کسی کا نہیں تھا۔۔۔!

وہ انسان جو کبھی بڑھ چڑھ کر باتیں بناتا تھا اب مُٹھّی بھر خاک اور سوکھی ہوئی ہڈّیوں کے علاوہ کُچھ نہ تھا۔ کیسی عبرت کا مقام تھا! جیک اور ملّاح نے مل کر وہ زمین پھر کھودی، راستہ دوبارہ صاف کیا اور ہم نے وہ خزانہ ایک بار پھر حاصل کر لیا۔ ہمارے دِل خوشی سے پُر تھے۔ بوریاں تو موجود تھیں ہی

اس لیے خزانہ بوریوں میں بھرنے کے بعد ہم واپس کومورن پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے اپنے گھوڑے بیچ دیے اور دو ملّاح اور حاصل کیے۔ ہمارے ساتھ جو ملّاح تھا اُس نے ہم سے درخواست کی تھی کہ اب وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہے چوں کہ اس نے ہماری مدد بھی بہت کی تھی اس لیے ہم نے اس کی یہ التجا قبول کرلی۔

کومورن سے روانہ ہونے پر جان کو ایک عجیب و غریب بیماری لاحق ہو گئی۔ شاید سمندر میں زیادہ عرصے تک رہنے کی وجہ تھی یا پھر اس کا بڑھاپا۔ اس بیماری کے باعث وہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔ کیوں کہ خشکی کا راستہ بہت مُشکل اور تکلیف دہ تھا اس لیے ہم نے جان بوجھ کر سمندری راستہ اختیار کیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ آئندہ ہمیں کیا کرنا ہو گا، ہم بمبئی پہنچ کر ہی سوچیں گے۔ اور پھر وہیں اس کا فیصلہ کریں

گے اور سوچیں گے کہ خزانے کا کیا کیا جائے۔

مختصر یہ کہ بمبئی پہنچنے کے بعد ہم ایک ہوٹل میں مقیم ہو گئے۔ قسمت کی خوبی دیکھیے کہ میں پہلے دِلّی کے ایک ہوٹل میں بیرا تھا مگر اب بمبئی کے ایک عالیشان ہوٹل میں کسی بگڑے ہوئے رئیس کی طرح بڑے کروفر سے رہ رہا تھا۔ یہاں آ کر ہم نے خزانے کے کئی حصّے کیے۔ حکومت کو اُس کا حصّہ دینے کے بعد بھی ہمارے پاس اتنا بچا تھا کہ ہماری ہزار پُشتیں بھی اپنی زندگیاں آرام سے گزار سکتیں تھیں۔ جان اور جیک نے فیصلہ کیا کہ چند ہفتے وہ اسی ہوٹل میں مقیم رہیں گے، پھر اس کے بعد امریکا جانے کا پروگرام بنائیں گے۔ ہم اب غریبوں اور محتاجوں کی بھی اتنی مدد کر رہے تھے کہ ہر طرف ہمارا شہرہ ہو گیا، بڑے بڑے لوگ ہم سے ملنے آنے لگے۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ ہم سے ملنے نہیں بلکہ ہماری بے شمار

دولت سے ملنے آ رہے ہیں۔

ایک دِن کا ذکر ہے کہ میں اور جان ہوٹل کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارا بیرا آیا اور میرے سامنے ادب سے جھُک کر کہنے لگا :

"جناب آپ سے ایک شخص ملنا چاہتا ہے۔ حُکم دیں تو یہیں بُلا لوں۔"

میں نے جواب طلب نظروں سے جان کو دیکھا اور ان نظروں کا مطلب سمجھ کر جان نے بیرے سے کہا۔

"نہیں۔ ہم فیروز کے کمرے میں چلتے ہیں، وہیں بُلا لاؤ۔"

بیرا سر جھُکا کر واپس چلا گیا اور پھر ہم دونوں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئے، جیک شاید کہیں گیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ ہماری ہونے والی گفتگو میں شامل نہ ہو سکا۔ ہم ابھی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھے بھی نہیں تھے کہ

دروازے پر دستک ہوئی۔ جان کے "کم اِن" کہنے پر دروازہ کھُلا اور بیرا ایک اُدھیڑ عمر شخص کو اپنے ساتھ لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ بغیر کسی سلام و دُعا کے وہ شخص بڑی تیزی سے میری طرف ہاتھ پھیلا کر بڑھا۔ اور پھر "میرے بچّے" کہہ کر مُجھ سے زبردستی لپٹ گیا۔ میں نے بڑی مُشکل سے خود کو چھڑایا اور پھر اس سے بولا:

"آپ کون ہیں اور کیوں مُجھ سے بغل گیر ہو رہے ہیں؟"

"مُجھے معلوم تھا میرے بچّے کہ تُم مُجھے نہیں پہچانو گے۔ ارے میاں میں جمال ہو جمال۔ تمہارا چچا۔"

حیرت کا ایک شدید حملہ مُجھ پر ہوا۔ خود جان کی بھی یہی حالت تھی۔ شاید وہ اس اجنبی کی گفتگو سمجھ گیا تھا۔ جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا آیا ہوں وہ دُنیا کی تقریباً سب ہی زبانیں تھوڑی ضرور جانتا تھا۔

"چچا۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب، کیا واقعی آپ فیروز کے چچا ہیں؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی اُردُو میں پوچھا۔

جان کی زبانی اتنا سُنتے ہی وہ شخص زار و قطار رونے لگا۔ ہم اس کی شکل تکے جاتے تھے اور وہ روئے جاتا تھا، کافی دیر تک یہ ڈرامہ ہوتا رہا۔ آخر مُجھے خود ہی اس کو خاموش کرنا پڑا۔ میں نے کہا:

"تعجّب ہے کہ مُجھے آج تک معلوم نہ سکا کہ میرا کوئی چچا بھی ہے؟ جس وقت میں روٹی کے دو ٹکڑوں کو محتاج تھا اور ایک ہوٹل میں بیرا گیری کر رہا تھا اُس وقت آپ کہاں تھے؟"

"آہ فیروز، میرے بیٹے۔ میرے دِل پر چر کے مت لگاؤ۔ مُجھے معلوم نہ تھا کہ تم پر کیا بیتی ہے؟ میں جاپان گیا ہوا تھا۔" اس شخص نے پھر مُجھے گلے لگانے کی کوشش کی مگر میں پیچھے ہٹ گیا۔ اور اسے تیز نظروں سے

گھورتے ہوئے بولا۔

"چلیئے مان لیتا ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ مگر اب آپ میرے پاس کیا لینے آئے ہیں؟"

"کیا لینے آیا ہوں؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "بیٹا تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں!"

"جی شکریہ۔ تکلیف کی ضرورت نہیں، مُجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ لٰہذا اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں!"

"مگر بیٹا۔ آخر تمہیں۔۔۔"

وہ شخص اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ جان نے فون اُٹھایا اور پھر آپریٹر کی بات سُن کر بولا۔ "انہیں بھی بھیج دیجیے۔"

"کون ہے؟" میں نے جان سے پوچھا۔

"دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے۔ اِس کا نام دُنیا ہے۔ فیروز! تمہارے ایک دوسرے چچا آرہے ہیں۔"

میں ابھی حیرت سے جان کو دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک نوجوان آدمی، بہترین سوٹ پہنے اندر داخل ہوا۔ مُجھے دور سے ہی انگریزی ملی اُردُو میں بولا۔

"ہیلو ڈیر فیروز۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔ تُم کیسے ہو؟ میٹ می۔ آئی آیم یوئر انکل۔"

میں جان کو دیکھ کر مُسکرایا اور پھر جان نے انگریزی میں ہی ان حضرت سے کہا۔

"آپ فیروز کے چچا ہیں۔۔۔؟"

"یقیناً۔ میں ہی فیروز کا چچا ہوں۔"

"مگر کون سے چچا ہیں؟ پہلے، دوسرے، تیسرے یا چوتھے۔؟"

"کیا مطلب؟" انہوں نے چونک کر پوچھا۔ "جنٹلمین! ہم صرف دو بھائی ہیں۔ وہ مُجھ سے بڑے تھے اور میں چھوٹا۔"

"خوب! تو پھر آپ انہیں بھی پہچانیئے۔"

جان نے پہلے آنے والے میرے 'چچا' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی فیروز کو اپنا بھتیجا کہتے ہیں!"

"واہ جناب، یہ اچھّی رہی۔ یہ کوئی طریقہ ہے۔ فیروز میرا بھتیجا ہے، کمال ہے کہ اب دوسرے لوگ بھی اس کے چچا بن کر آنے لگے!"

اتنا کہہ کر وہ صاحب میرے پہلے "چچا: سے لڑنے لگے۔ ہم دونوں

خاموش بیٹھے ان کی نوک جھونک دیکھتے رہے اور جب یہ لڑائی بڑھتی ہی گئی تو میں نے اُکتا کراُن سے کہا :

"خاموش رہیے ، صاجبان ! لڑیے مت اور براہِ کرم فوراً یہاں سے تشریف لے جائیے ، میں ایک یتیم لڑکا ہوں اور جہاں تک مُجھے معلوم ہے میرا کوئی چچا نہیں ہے ، اس لیے آپ دونوں یہاں سے فوراً نکل جائیے ۔"

وہ دونوں حیرت سے میرا مُونہہ تکنے لگے ۔ انہوں نے کُچھ کہنے کے لیے مُونہہ کھولا ہی تھا کہ جان نے انہیں ڈانٹ دیا اور وہ لرزتے کانپتے باہر چلے گئے ۔ ان کے جانے کے بعد جان سوچ میں پڑ گیا۔ آخر کُچھ دیر بعد بولا :

"یہ تو بڑی مُصیبت ہوئی فیروز۔ اس طرح تو روزانہ کوئی نہ کوئی تمہارا چچا یا ماموں بن کر آنے لگے گا۔ آخر ایسے لوگوں سے ہم کس طرح نجات

حاصل کریں گے۔ ویسے ایک بات ہے فیروز۔ ۔ ۔!"

"فرمائیے کون سی؟"

"تم نے تو آج تک مُجھے بھی اپنے بارے میں کُچھ نہیں بتایا کہ تم کون ہو، اور تمہارے والدین کون تھے، ان کا پیشہ کیا تھا؟"

"والدہ کے بارے میں تو میں کُچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا: "میں بہت چھوٹا سا تھا جب کہ اُن کا انتقال ہو گیا تھا۔ ۔ ۔ ہاں بس مُجھے اتنا یاد ہے کہ تین یا چار سال کی عُمر تک میں ایک بہت بڑے اور صاف سُتھرے مکان میں رہتا تھا۔ ایک عورت تھی جو شاید میری آیا تھی۔ وہ مُجھے بڑے لاڈ و پیار سے رکھتی تھی اور مُجھے میرے والد کے قصّے مزے لے لے کر سُناتی تھی۔"

"والد کے قصّے!" جان نے حیرت سے کہا۔ "اِس کا مطلب ہوا کہ تم نے اپنے والد کو نہیں دیکھا؟"

"جی ہاں یہی سمجھئے۔ صرف دو تین بار دیکھا تھا۔ پانچ چھ سال کی عمر میں ایسی باتیں یاد کسے رہتی ہیں۔ میری عُمر اتنی ہی تھی۔ ہلکا سا نقشہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ وہ ایک لمبے تڑنگے آدمی تھے اور ان کی مونچھیں بھی تھیں۔ شاید وہی میرے والد ہوں گے۔"

"پھر وہ کہاں گئے۔۔۔؟" جان نے جلدی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں کہاں گئے، میں کہہ نہیں سکتا۔"

"تو تم دِلّی کے ہوٹل میں کس طرح ملازم ہوئے؟"

"مُجھے اتنا یاد ہے کہ اُس بُوڑھی عورت نے مُجھے ایک گھر میں بھیج دیا تھا۔

جہاں بچّے ہی بچّے تھے۔ اُن بچّوں کے ماں باپ بھی نہیں تھے۔ اس وقت تو مُجھے معلوم نہ تھا کہ اس گھر کو کیا کہتے تھے، ہاں مگر اب میں جانتا ہوں کہ وہ یتیم خانہ تھا اور اسی یتیم خانے سے بعد میں مُجھے دِلّی کے اُس ہوٹل میں بیرا بنا کر بھیج دیا گیا۔ بس یہی میری کہانی ہے۔"

اتنا کہہ کر میں افسردہ ہو گیا۔ دِل میں عجیب عجیب خیالات آنے لگے۔ ماں اور باپ جنھیں میں نے بہت ہی کم دیکھا تھا مُجھے یاد آ گئے۔ دِل سے ایک ہوک سی اُٹھی اور آپ ہی آپ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ میں پھر اتنا بے تاب ہوا کہ مُونہہ چھُپا کر بُری طرح رونے لگا۔ یہ دیکھ کر جان نے جلدی سے اٹھ کر مُجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میرے آنسو پونچھے اور کہنے لگا۔

"گھبراؤ مت فیروز! میرے بیٹے، میں کل بمبئی کے سب یتیم خانوں میں

جاؤں گا۔ اور خُدا نے چاہا تو تمہارے والد کے بارے میں بہت کُچھ پوچھ کر آؤں گا۔ تم اپنا دِل چھوٹا مت کرو اور آرام کرو۔"

آرام تو اب مُجھے کرنا ہی تھا۔ کیوں کہ اب میں اتنا دولت مند تھا کہ میری پوری زندگی عیش و آرام میں گُزر سکتی تھی۔ مگر جسے سکون کہتے ہیں، وہ مُجھے میسّر نہیں تھا۔ لوگوں کے کہنے سے بار بار یہ بات دل میں کھٹکتی تھی کہ آخر میں کون ہوں؟

میرے ماں باپ کون تھے؟

میرے والد زندہ ہیں یا مر گئے؟

ہر وقت بس میں یہی بیٹھا ہوا سوچتا رہتا۔ بہت سے لوگ مُجھ سے ملنے آئے، مگر میں نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ مُجھے یقین تھا کہ ان میں سے بیشتر

میرے چچا، ماموں، بھائی یا دور کے رشتے کے عزیز ہوں گے۔ کچھ چندہ مانگنے آئے ہوں گے اور کچھ مجھے اپنے کلب کا ممبر بنانے۔ زندگی اسی طرح گزر رہی تھی کہ ایک دِن جان ایک بوڑھی عورت کو اپنے ساتھ لیے ہوئے میرے کمرے میں آیا۔ عورت لاٹھی ٹیک کر چل رہی تھی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور وہ بہت زیادہ عمر رسیدہ تھی۔

"فیروز! یتیم خانوں میں پوچھ گچھ کے بعد میں نے تمہاری آیا کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ دیکھو یہی تمہاری وہ آیا ہیں جو تمہیں بچپن میں بہت پیار کرتی تھیں؟ آؤ ان سے ملو۔"

"فیروز بیٹا! تو کہاں ہے۔ میرے پاس آ، مجھے بہت کم دِکھائی دیتا ہے میرے لال۔" عورت نے لرزتی آواز میں کہا۔

لفظ تو سُن کر ہی میں سمجھ گیا کہ در حقیقت وہ میری آیا ہے۔ خوشی کے

مارے کپکپاتا ہوا میں اس کے پاس پہنچا۔ میری شکل خوب غور سے دیکھنے کے بعد اس نے مُجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"میرے چاند! میں نے تُجھ پر کتنے ظُلم ڈھائے ہیں۔ ہائے، میں بھی کتنی کم بخت ہوں کہ تُجھے پال نہ سکی۔ مُجھ نصیبوں جلی نے تُجھے یتیم خانے میں داخل کرا دیا۔ مگر بیٹے اللہ گواہ ہے کہ میرے پاس کھانے کے لیے ایک دانہ بھی نہ تھا۔ تو میرے پاس رہتا تو فاقوں سے مر جاتا میرے بچّے۔۔۔!"

اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔ میں خود بھی اس سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ جب ہم دونوں کے دلوں کا بوجھ ہلکا ہوا تو جان نے عورت سے کہا۔

"امّاں۔۔۔ اب تو تُم نے پہچان لیا کہ یہ فیروز ہے۔ تم راستے میں کہتی

تھیں کہ اس کے سینے پر ایک کالا داغ ہے، میں دیکھ چکا ہوں کہ وہ داغ واقعی اس کے سینے پر ہے۔ فیروز تم انہیں وہ داغ بھی دِکھا دو۔"

میں نے سینہ کھول کر آیا کو وہ داغ دکھایا تو وہ پھر مُجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ جان کے بار بار یہ کہنے پر کہ وہ میرے والد کے بارے میں بتائے، بڑھیا نے کہنا شروع کیا:

"فیروز کسی معمولی خاندان سے نہیں ہے صاحب، بلکہ اس کی رگوں میں نوّابی خُون دوڑ رہا ہے۔ اس کے دادا نوّاب تھے اور کلکتہ میں ان کی بہت بڑی جائیداد تھی۔ اس کے والد بہت پڑھے لکھے آدمی تھے انہوں نے امریکہ میں ڈاکٹری کی تعلیم پائی تھی اور بڑے عرصے کے بعد بمبئی لوٹے تھے۔ بمبئی ہی میں اُن کی شادی ایک بوہرے سیٹھ کی لڑکی سے ہوئی۔ شادی کے بعد ہی جنگ شروع ہو گئی۔ اس کے والد بہت بڑے سرجن

تھے اس لیے انھیں بھی لڑائی پر جانا پڑا۔ تب ہی فیروز پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے دو مہینے کے بعد اس کی ماں ایک بیماری میں مر گئی۔ اور ننّھے فیروز کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گئی۔ تب میں نے اِسے پالا پوسا اس کے والد صرف دو بار اسے دیکھنے آئے تھے، اور پھر ان کا پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں گئے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ جنگ میں کام آ گئے ہوں گے۔"

یہ خبر سُن کے میرے دِل کو ایک دھچکا لگا۔ مگر یہ انکشاف میرے لیے خوشی کا باعث تھا کہ میں ایک اعلیٰ خاندان سے تعلّق رکھتا ہوں۔ بڑھیا نے سانس لے کر پھر کہنا شروع کیا۔

"میں اتنی بے وقوف تھی کہ میں نے قانون کی مدد لیے بغیر فیروز کو گھبرا کر یتیم خانے میں داخل کرا دیا۔ میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ ایک بہت بڑی جائیداد کا مالک ہے اور اسے یتیم خانے میں داخل ہونے کی کوئی ضرورت

نہیں تھی، میں تو بس اپنی غریبی سے عاجز تھی۔ پریشان تھی اسی لئے یہ عجیب کام کر بیٹھی۔"

"مگر اماں، فیروز کے والد کا نام کیا تھا۔ یہ تم نے نہیں بتایا؟"

"کرنل پرویز تھا ان کا نام۔ وہ بہت خوب صورت اور بہادر۔۔۔"

"کرنل پرویز۔۔۔!" جان نے چونک کر کہا:

"اور تم نے کہا ہے کہ انہوں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی تھی؟"

"جی ہاں۔ میں کیا بتاؤں کتنے اچھّے آدمی تھے وہ۔"

"فیروز۔۔۔۔!" جان نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف پھیلاتے ہوئے کہا:

"فیروز میرے بچّے، تمہارے نقلی چچا تو تمہیں بہت سے ملے مگر اب اپنے اصلی چچا سے بھی مل لو۔"

"کیا مطلب یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے تعجّب سے کہا۔

"کاش مُجھے پہلے سے معلوم ہوتا! مگر خُدا کی مرضی بھی یہی تھی۔ میرے بیٹے، تمہارے والد کو میں نے اچھّی طرح دیکھا ہے۔ کیوں کہ وہ میرے ساتھ ہی کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔"

میں حیرت سے ایک ایک کو دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا قصّہ ہے۔ جان نے مُجھے گلے لگانے کے بعد سب باتیں تفصیل سے بتائیں۔۔۔

والد صاحب کے بارے میں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات تک مُجھے بتائی۔

اس نے بتایا کہ والد کافی عرصے تک واشنگٹن کے ایک کالج میں اس کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے تھے اور دونوں بہت ہی اچھّے دوست تھے۔ جان نے مُجھ سے وعدہ کیا کہ اس کے پاس والد کی جو تصویریں ہیں ان میں سے بہت سی وہ مُجھے بھیج دے گا۔ آخر میں اس نے کہا :

"مُجھے فخر ہے فیروز کہ تُم ایک بہت اچھّے خاندان سے ہو۔ پہلے تمہاری باتیں سُن سُن کر میں حیرت کیا کرتا تھا کہ ایک معمولی سا لڑکا آخر کس طرح ایسی عقل مندی کی باتیں کر سکتا ہے! مگر مُجھے اب کوئی حیرت نہیں ہے۔ تم اس باپ کے بیٹے ہو جو کالج میں ہمیشہ اوّل آیا کرتا تھا، جو بے حد بہادر اور ذہین تھا اور اس کی یہ ذہانت اور بہادری ہی تمہارے اندر پائی جاتی ہے۔"

یہ ہے وہ عجیب و غریب داستان جسے پڑھتے ہوئے کئی بار آپ نے اپنے

دِل میں کہا ہوگا کہ یہ ناممکن ہے۔۔۔!

مگر یہ حقیقت ہے اور مُجھ پر بیتی ہے۔ ان واقعات کو بیتے ہوئے اب عرصہ ہوگیا ہے۔ اس وقت میں اپنے عالیشان کمرے میں بیٹھا ہوا یہ کہانی لکھ رہا ہوں۔ میری بیوی دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی میری ننّھی سی بچّی کے لیے اُونی سوئیٹر بُن رہی ہے۔۔۔ میرے دادا اور میرے والد کی جتنی بھی جائیداد تھی اس کا اب میں تنہا مالک ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میری اپنی ایک جہاز کمپنی بھی ہے، میرے جہاز دور دراز کے ملکوں میں آتے جاتے ہیں۔ یہی اب میرا کاروبار ہے اور خُدا کا شکر ہے کہ میری ایمان داری کی بدولت یہ کام خوب چل رہا ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں مُجھے یہ عزّت صرف اس وجہ سے ملی ہے کہ میں ہمیشہ دوسروں کا وفادار رہا۔ میں نے کبھی لالچ اور بے ایمانی نہیں کی۔

جان کے بارے میں مُجھے اتنا اور بتانا ہے کہ مکھّی کی آنکھیں حفاظت سے بند کر کے وہ انہیں اپنے ساتھ امریکہ لے گیا۔ رہے جیک اور ملّاح، تو جیک تو جان کے ساتھ ہی امریکہ چلا گیا تھا۔ ملّاح جس کا نام کرشنا سوامی ہے، اب میرے ساتھ ہی ہے اور میرے کام کو چلاتا ہے، ایک طرح سے وہ میرے کام میں میرا سب سے بڑا مددگار بنا ہوا ہے۔

جان آج کل واشنگٹن میں اندھے بچّوں اور بیواؤں کا ایک اسکول چلا رہا ہے۔ اس خوف ناک مکھّی کی آنکھوں کی مدد سے اس نے بہتیرے بچوں کی آنکھوں کو روشنی عطا کی ہے، اور ہزاروں بیواؤں کی مالی امداد بھی کی ہے۔ اب بھی اس کے خط میرے پاس آتے رہتے ہیں اور ان خطوں کو پڑھ کر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دُنیا میں صرف مُجھ سے، میری بیوی زرینہ اور بچّی نجمہ سے محبّت کرتا ہے۔ کئی بار وہ بذریعہ ہوائی جہاز امریکہ سے بمبئی آیا

اور مُجھ سے مل کر گیا۔ اس سے بچھڑتے وقت مُجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے حقیقی باپ سے جدا ہو رہا ہوں!

ایک خوش خبری اور سنئے۔ چند دِن پہلے ہی مُجھے جان کا خط ملا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی تمام دولت میری ننّھی نجمہ کے نام لکھ دی ہے۔ میرے نام اِس لیے نہیں لکھی کہ اب اُسے مُجھ سے زیادہ میری بچّی نجمہ پیاری ہے۔

مُجھے اب دُنیا میں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میری محنت، ہمّت اور وفاداری نے مُجھے وہ کُچھ دے دیا جو شاید کسی شہنشاہ کو بھی نہ ملا ہو گا۔ دولت، عزّت، شہرت اور دُنیا بھر کے عیش و آرام۔۔۔ مُجھ سے زیادہ خوش نصیب شاید ہی اس دُنیا میں کوئی ہو!

میرے حیرت انگیز، خوفناک اور طویل سفر نے مُجھے یہی سبق دیا ہے کہ

اگر ہم مُصیبتوں سے نہ گھبرائیں، ہر حال میں خُدا سے لَو لگائے رکھیں، ڈر اور خوف کو دِل کے قریب بھی نہ آنے دیں۔ ہمّت، ایمان داری اور محنت سے ہر کام کریں تو خُدا ہماری مدد ضرور کرے گا اور ہم ایک ایسے درجے پر پہنچ جائیں گے کہ دُنیا رشک کرے گی۔ میری مثال آپ کے سامنے موجود ہے۔

اچھّا اب اجازت چاہوں گا۔ دوسرے کمرے سے زرینہ مُجھے سوئیٹر کا نمونہ پسند کرنے کے لیے بُلا رہی ہے اور میں دو گھنٹے سے یہی کہہ رہا ہوں کہ بس ایک منٹ میں آیا۔

اب چلتا ہوں، خُدا حافظ!

خَتم شُد